اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ

جمع قرآن

مُؤلّفہٗ

مولوی محمّد علی صاحب ایم-اے

سنہ ۱۹۱۷ء

مطبوعہ مُفید عام پریس لاہور

دفعہ اوّل

قیمت فی جلد ۱۰ ار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علےٰ رسولہ الکریم

جمع قرآن

(۱) قرآن کریم کے لیئے حفاظت الٰہی کا وعدہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (سورۃ الحجر آیت ۹)

ترجمہ۔ اِس قرآن کو ہم نے آپ ہی نازل کیا ہے۔ اور اسکی حفاظت ہم خود ہی کریں گے۔ +

حفاظت قرآن کے متعلق غیروں کا اعتراف

اللہ جو عیب اور نقص سے پاک ہے اس کے وعدوں کو جب دیکھا جاتا ہے۔ اور پھر انکے پورا ہونے پرغور کیا جاتا ہے تو اس کی عظمت اور جلال پر دل اور بھی زیادہ ایمان اور عرفان سے معمور ہوتا ہے۔ اور جس عیاں اور زبردست طور پر اس کے وعدے پورے ہوتے ہیں ان کا اعتراف نہ صرف مومن ہی کو ہوتا ہے بلکہ غیر مومن بھی طوعاً و کرہاً اس پر گواہی دینے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ آلٰہی جو آیت مندرجہ عنوان میں دیا گیا تھا جس عظمت اور صفائی کے ساتھ اُس کے پُورا ہونے کی حقیقت دُنیا پر آج تک ثابت اور ظاہر ہوئی ہے وہ ایسی روز روشن کی طرح چمکتی ہے کہ بڑے بڑے مخالفان قرآن کریم بھی اسکی واقعیت اور حقیت پر بیساختہ شہادت دے اُٹھے ہیں۔ ہم اس جگہ ایک مخالف کے الفاظ ہی نقل کرنے پر کفایت کرینگے جس کا نام سر ولیم میور ہے۔ اور جس نے اسلام کی مخالفت کیلیئے کتاب لائف آف محمدؐ لکھی اور شائع کی تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ کے صفحہ ۲۱ (طبع سوم) پر اس نے قرآن کریم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "جہاں تک ہمارے معلومات ہیں دُنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن کریم) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"۔ اور پھر ایک دوسرے عیسائی وان ہیمر کا قول نقل کرتا ہے کہ "ہم ایسے ہی یقین کے ساتھ قرآن (شریف) کو بعینہٖ محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مُنہ سے نکلے ہُوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسا کہ مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں" جس میں صاف اعتراف اس بات کا پایا جاتا ہے کہ جو قرآن شریف اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے بیلا کم و کاست وہی قرآن کریم ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اور اسکی کسی عبارت یا کسی لفظ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی +

وعدۂ حفاظت اور الذکر سے مراد

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے اسباب اور حالات تھے جن کی وساطت سے یہ مقدس ترین کتاب ہمیں بغیر کسی تحریف اور آمیزش کے ٹھیک اسی طرح پہنچی جس طرح ہمارے سید و مولےٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم پر

فہرست مضامین جمع قرآن

نازل ہوئی تھی؟ ان اسباب کا تعلق مذہب اسلام کی تاریخ کے دو مختلف زمانوں کے ساتھ ہے یعنی اول زمانہ حیات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرا زمانہ خلفائے راشدین جنہوں نے کمال دیانت اور امانت کے ساتھ اس مقدس کلام کو آیندہ نسلوں تک ٹھیک اسی طرح پہنچایا جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے چھوڑا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں پنجاب رلیجس ٹریکٹ سوسائٹی لاہور کی طرف سے ایک کتاب مسمی تاویل القرآن اُردو زبان میں شائع ہوئی تھی جس کے مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اس کتاب میں گمنام مصنف نے آیت مذکورہ عنوان کے متعلق بھی خامہ فرسائی کرنے کی جرات کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس آیت میں الذکر سے مُراد مُطلق قرآن شریف نہیں بلکہ تمام کتب سماوی مُراد ہیں۔ پس قبل ان اسباب کو بیان کرنے سے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصنف تاویل القرآن کی غلطی کو ظاہر کیا جائے اس میں شک نہیں کہ لفظ ذکر جیسا قرآن شریف کے لئے بولا گیا ہے دوسری کتب سماوی کے لئے بھی بولا گیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس خاص موقعہ پر جہاں آیت زیر بحث میں یہ لفظ آیا ہے وہاں مُراد اس سے قرآن کریم ہے یا جملہ کتب سماوی سو خود قرآن کریم کے پڑھنے سے اور آیت زیر بحث کے ماقبل اور مابعد پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ آیت مذکورہ سُورۂ حجر کی نویں آیت ہے۔ اور سُورہ شریفہ اس طرح پر شروع ہوتی ہے۔ الرٰ تلك آيات الكتٰب وقرآن مبين۔ اور پھر چھٹی آیت سے آیت زیر بحث تک کلام الٰہی میں یُوں وارد ہوا ہے۔ وقالوا يا يها الذى نزل عليه الذكر انك لمجنون۔ لوما تاتينا بالملٰئكة ان كنت من الصٰدقين۔ ما ننزل الملٰئكة الا بالحق وما كانوا اذا منظرين انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون ترجمہ۔ اور کافروں نے کہا کہ اے شخص جس پر الذکر اُتارا گیا ہے تو تو دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو فرشتوں کو ہمارے سامنے کیوں نہیں لا کھڑا کرتا۔ ہم فرشتوں کو نہیں بھیجا کرتے۔ مگر فیصلہ کے لیئے۔ اور (جب فرشتے نازل ہونگے تو) پھر انکو مہلت بھی نہ ملیگی۔ بیشک ہم ہی نے الذکر اُتارا ہے اور بیشک ہم ہی اسکی حفاظت بھی کرینگے"۔ ان چار آیتوں میں دو جگہ لفظ الذکر آیا ہے۔ اور سلسلہ کلام سے ظاہر ہے کہ جو کچھ الذکر سے پہلی یعنی چھٹی آیت میں مُراد ہے وہی مُراد آخری یعنی نویں آیت یا آیت زیر بحث میں ہے لیکن پہلی جگہ لفظ الذکر سے صاف مُراد قرآن شریف ہے وہی قرآن مبین جس کا ذکر شروع سُورۃ میں ہے۔ کیونکہ کافروں کا خطاب صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ الذی نزل علیہ الذکر سے یقیناً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُراد ہیں۔ پس الذکر سے مُراد قرآن شریف ہی ہوا نہ جملہ کتب سماوی۔ اور یہی مُراد اس لفظ سے دونوں جگہ ہے۔ اسی بات کی تائید قرآن کریم کی اور آیات سے بھی ہوتی ہے مثلاً سورہ حٰم السجدۃ کی آیات ۴۱-۴۲ میں بعینہ اسی مضمون کو دوہرایا گیا ہے۔ ان الذين كفروا بالذكر لما جاءهم وانه لكتاب عزيز لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد۔ ترجمہ۔ جن لوگوں کے پاس الذکر یعنی قرآن آیا اور اُنہوں نے اس کو نہ مانا (وہ بھی اپنا انجام کار دیکھ لیں گے) اور یہ (قرآن) تو بڑے پایہ کی کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اُس کے آگے (ہی کی طرف) اُسکے پاس بھٹکنے پاتا ہے اور نہ اُس کے پیچھے (کیطرف) سے (کیونکہ) حکمت والے سزاوار حمد

(وثنا یعنی خدا) کی اُتاری ہُوئی ہے۔ ایسا ہی اور بھی کئی آیات ہیں جو صاف طور سے اعلان کر رہی ہیں کہ قرآن شریف میں شروع سے ہی یہ آلٰہی وعدہ ہے کہ خدا تعالیٰ اسکو ہر قسم کی تحریف۔ آمیزش۔ تغیّر و تبدل اور بربادی سے ہمیشہ کیلئے محفوظ رکھیگا +

حفاظت قرآن پر ابتدا سے اہل اسلام کا ایمان

ابتدائی زمانہ سے ہی مُسلمانوں کا یہ اعتقاد چلا آتا ہے۔ کہ ان آیات میں خدا تعالےٰ نے قرآن شریف کو ہر قسم کے حملوں اور تصرّف سے محفُوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہُوا ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ جو تابعین میں سب سے پہلے مُفسّرانِ قرآن ہیں وہ بھی اِس پر اتّفاق رکھتے ہیں۔ کہ آیت انّا نحن نزلنا الذّکر و انّا له لحافظون اور آیت لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید سے یہی مطلب ہے کہ اِس کلام پاک میں کوئی ایسا لفظ نہیں ڈالا جائیگا جو کلام آلٰہی نہو۔ اور نہ ہی کوئی حصّہ کلام آلٰہی اس میں درج ہونے سے بچایا جائیگا یا درج ہونے کے بعد نکالا جاسکیگا۔ ایسا ہی یہ دونوں بزرگ اور اِنکے علاوہ تمام مفسرین قرآن کریم اسبات پر متفق ہیں کہ الذّکر سے مُراد اِن دونوں آیات میں قرآن کریم ہی ہے۔ دیکھو تفسیر ابن جریر جلد ۱۴ صفحہ ۶ و جلد ۲۴ صفحہ ۷۱-۷۲ غرض یہ ایک ایسی بیّن اور ثابت شُدہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے پہلے اور پچھلے مُفسّرین اِن آیات حفاظت قرآن کریم کے مُتعلق وہی اعتقاد رکھتے تھے جو آج کل مسلمانوں میں مُتفقہ طور پر مُروّج و مسلّم ہے۔ اور اس اَمر کی کافی شہادت موجود ہے۔ ایسی صریح اور ثابت شدہ حقیقت پر جو آفتاب نصف النہار کی طرح چمک رہی ہے بے اعتباری کا پردہ ڈالنا ایک بیہُودہ اور احمقانہ کوشش نہیں تو اَور کیا ہو سکتا ہے +

ایفائے وعدہ کے ثبوت

مُصنّف تاویل القرآن نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی وعدے کا وجود اسبات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ اس کا ایفاء بھی ہو گیا۔ اور اسلیئے وعدہ خود ثبوت نہیں ہو سکتا۔ ان کے اس خیال کے ساتھ تو ہم اتفاق کرتے ہیں لیکن انہیں اِس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اس وعدے کے ساتھ ایسے واقعات موجود ہیں جن پر نگاہ انصاف ڈالنے سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے۔ کہ اس وعدہ کا ایفا نہایت صفائی اور عمدگی کے ساتھ ہُوا ہے۔ کیونکہ اگر یہ وعدہ پُورا نہ ہُوا ہوتا اور قرآن کریم میں کسی قسم کے تغیّر و تبدل کو دخل ہو گیا ہوتا۔ تو یہ ضروری تھا کہ ان دو باتوں میں سے ایک ظہور واقعہ ہوتی یعنی یا تو جن لوگوں نے ان تصرفات و تغیّرات کو دیکھا تھا یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم وہ اس کے کلام آلٰہی ہونے کا اِنکار کرتے۔ یا ان آیات بینات کی جن میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے موجودہ تفسیر کے سوا کوئی اور تعبیر و تاویل کرتے لیکن یہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ اس وجہ پر کسی نے قرآن شریف کے کلام آلٰہی ہونے سے اِنکار نہیں کیا۔ اوّل تو ارتداد ہی شاذ و نادر تھا مگر اِس بنا پر کہ یہ وعدہ پُورا نہیں ہُوا کوئی بھی مُرتد نہیں ہُوا اور نہ کسی صحابی نے آیات وعدہ حفاظت قرآن کی کوئی اور تفسیر یا تاویل کی۔ بلکہ سب کے سب بالاتفاق اِسی اعتقاد پر جمے رہے اور ایک صحابی کا نام بھی نہیں بتایا جاسکتا جس نے اِن دو شقوں میں سے کوئی ایک اختیار کی ہو۔ بلکہ جن معنوں کا پتہ ہمیں تابعین سے ملتا ہے جن کے معلم اجلہ صحابہ تھے وہ وہی معنے ہیں جو ہمنے اوپر اختیار کیئے ہیں اور جن کی بنا پر شروع سے لیکر آج تک تمام مسلمان قرآن کی حفاظت کے آلٰہی وعدے کو سچا یقین کرتے چلے گئے ہیں اصحاب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی ان لفظوں کے یہی معنے کرتے تھے۔ ان کے سوا

اطولکن یدا کی پیشگوئی اور اسکی تاویل

کوئی اور مطلب ان الفاظ کا ان سے کہیں ثابت نہیں۔ اگر وہ ان الفاظ کے کوئی اور معنے کرجاتے تو ضرور تھا کہ وہ ہم تک بھی پہنچتے جیسا کہ ایک اور پیشگوئی کی تفسیر اور معنے بیان کرنے میں ہوُا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ نے اپنی ازواج مُطہرات کو مخاطب کرکے فرمایا۔ اسرعکن لحوقابی اطولکن یدا جس کے ظاہر معنے یہ ہیں۔ کہ تم میں سے مجھے وفات پاکر سب سے پہلے ملیگی جس کے لمبے ہاتھ ہیں چنانچہ وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بروایت حضرت عائشۃ اُمّ المومنین درج ہے ذیل میں نقل کی جاتی ہے عن عائشۃ اُمّ المومنین قالت قال رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسرعکن لحوقابی اطولکن یدا فکن یتطاولن ایتھن اطول یدا قالت فکانت اطولنا یدا زینب لانھا کانت تعمل بیدھا وتصدق۔ ترجمہ۔ حضرت اُمّ المومنین عائشۃ صدیقہ سے روایت ہے کہ رسُول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ تم میں سے مجھ کو جلدی وہ ملیگی جس کے ہاتھ لمبے ہیں حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ یہ بات سُنکر تمام ازواج مُطہرات اپنے اپنے ہاتھ اس بات کے دریافت کرنے کے لئے ناپنے لگیں کہ کس کے سب سے لمبے ہاتھ ہیں پھر آخر کار زینبؓ کے ہاتھ اُس کی سخاوت کی وجہ سے اِس حدیث کے منشاء کے مطابق سب سے لمبے ثابت ہُوئے"۔ ان مقدس بیبیوں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سُن کر اسکے یہی معنے سمجھے کہ گویا اس سے مُراد جسمانی طور پر لمبے ہاتھ ہیں۔ اور اسی لیئے غلط فہمی سے ایک دوسرے سے ہاتھوں کو ناپنا شروع کردیا لیکن احادیث کی کتابیں ایسی احتیاط اور راستبازی سے لکھی گئی ہیں کہ کسی قسم کی رعایت کے بغیر تمام امور کو درج کردیا گیا ہے۔ ان کی یہ غلطی بھی حدیثوں میں صاف طور پر درج ہے۔ اور اس کے صحیح معنے بھی کھلے طور پر لکھے ہوئے موجود ہیں۔ چنانچہ امام نووی نے اس حدیث کے معنے یہ لکھے ہیں معنی الحدیث انھن ظنن ان المراد بطول الید طول الید الحقیقیۃ وھی الجارحۃ فکن یذرعن ایدیھن بقصبۃ فکانت سودۃ اطولھن جارحۃ وکانت زینب اطولھن یدا فی الصدقۃ وفعل الخیر فماتت زینب اولھن فعلموا ان المراد طول الید فی الصدقۃ والجود قال اھل اللغۃ یقال فلان طویل الید وطویل الباع اذا کان سمحا جوادا۔ یعنی اس حدیث کے یہ معنے ہیں کہ حضرت رسول کریم صلعم کی بیویوں نے یہی سمجھا تھا۔ کہ لمبے ہاتھوں سے مُراد نے الحقیقۃ لفظی طور پر لمبے ہاتھ ہی ہیں۔ اور اسلئے اُنہوں نے اپنے ہاتھوں کی لمبائی کو ناپنا شروع کردیا۔ ناپنے سے معلوم ہوُا کہ آنحضرتؐ کی بیوی سودہ کے ہاتھ سب سے لمبے تھے اور حضرت زینبؓ صدقہ وخیرات میں سب سے کھلا ہاتھ رکھتی تھیں۔ اور وہی سب سے پہلے فوت ہوئیں۔ اُس وقت ان کو معلوم ہوگیا۔ کہ اس حدیث کے اصل معنے یہ تھے کہ لمبے ہاتھوں سے مُراد سخاوت اور خیرات اور صدقہ میں سب سے سبقت اور فوقیت تھی۔ اہل لغت ایسے فقرات کے یہی معنی کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کہتے ہیں کہ فلان طویل الباع یا فلان طویل الید تو اس سے یہی مُراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص بہت بڑا سخی اور فیاض طبع ہے (دیکھو نووی حاشیہ مسلم) ایسا ہی حضرت امام بُخاری اور مشہور و معروف صاحب فتح الباری بھی اِس امر پر مُتفق ہیں کہ اس حدیث کے معنے ازواج مُطہرات نے پہلے یہ سمجھے تھے لیکن بعد میں اُن پر منکشف ہوگیا کہ اسکے معنے وہ نہیں جو انہوں نے سمجھے ہوئے

تھے بلکہ سخاوت اور فیاضی میں سبقت مُراد تھی (دیکھو بُخاری باب صدقات) +

اہلِ اسلام کی حق گوئی

غرض اسلامی لٹریچر میں دین کو ایسا مُقدم رکھا گیا ہے کہ کسی شخص نے کسی کی کبھی کچھ رعایت نہیں کی اور نہ ہی کسی کی پاس خاطر سے کبھی کسی امر کا اخفا یا کم و بیش کر کے لکھا گیا۔ یہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے ایک حدیث کے سمجھنے میں غلطی کھائی تو اکثر معتبر کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی تھی اگرچہ یہ پیشگوئی قرآن کریم کا کوئی حصہ نہ تھی لیکن آنحضرت صلعم کی فرمائی ہُوئی تھی اسلیئے وہ اپنے صحیح منطوق کے ساتھ پوری ہُوئی یعنی اُمّ المومنین زینب جو جود و سخا اور کرم و فیض میں سب بیویوں سے بڑھی ہوئی تھیں سب سے پہلے فوت ہوئیں اور سودا رضؓ پہلے فوت نہ ہوئیں جن کے ہاتھ جسمانی طور پر لمبے تھے جبکہ ایسی معمولی درجہ کی باتوں کے اختلافات اور معانی احادیث میں اس قدر دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ درج ہیں تو قرآن کریم کی حفاظت کے وعدوں کی آیات جو ایک پہلو سے اصُول اسلام میں شمار ہوتی ہیں اور ایسی اہم اور ضروری ہیں کہ ہر ایک کو اُن کے معانی کے ساتھ بڑا بھاری تعلق ہے تو ایسے اہم امر کی متعلقہ آیات کے لفظی معنوں اور اس عظیم الشان وعدہ کے ظاہری رنگ میں پُورا ہونے میں ذرہ بھی اختلاف اور انحراف واقعہ ہوتا تو نہایت ضروری تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کثیر اس طرف جاتی کہ اس پیشگوئی سے مُراد اس کا ظاہری الفاظ میں پورا ہونا نہیں بلکہ اس سے کچھ اور مطلب ہے اور وہ مطلب بیان کرتے اور آیندہ نسلوں کو اس سے مطلع کرتے لیکن حدیث کے اتنے بڑے ذخیرے میں کہیں کسی جگہ صحیح اور مستند تو کیا کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی اِس بات کی تائید میں نہیں ملتی جس میں صراحت سے نہ سہی کنایتہً ہی یہ اشارہ ہو کہ یہ وعدہ الٰہی اپنے ظاہری معنوں میں پُورا نہ ہُوا تھا اور اس کی تاویل یہ کی گئی تھی +

عدمِ تحریف کا یقینی ثبوت

کسی حدیث میں اس بات کا صراحتاً یا کنایتاً ذکر نہ ہونا ایک ایسی زبردست دلیل قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی ہے کہ اس کے بعد کسی دلیل کے دینے کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اس سے قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اور ان کی زندگیوں میں ایک حرف کی بھی تحریف یا تغیر تبدل یا کمی زیادتی نہیں ہوئی بلکہ صحابہؓ کرام کے بعد بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ بزرگ قوم تابعین جنہوں نے بڑی محنتوں اور مشکلات سے محض اللہ تعالےٰ کی رضاجوئی اور دین کی خاطر صحابہؓ سے قرآن شریف سیکھا تھا اور احادیث حاصل کی تھیں اور اُنکی صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ اس امر پر متفق ہیں کہ ان آیات سے یہی مراد ہے کہ قرآن شریف میں کوئی تصرف اور آمیزش کبھی راہ نہ پائے گی۔ اور خدا اس کی نگہبانی کرتا رہیگا۔ اس تمام تحریر سے یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ آنحضرت صلعم کے اصحابؓ قرآن شریف کی حفاظت کی پیشگوئی مندرجہ قرآن کریم کا پورا ہونا ظاہری الفاظ کے موافق مانتے تھے۔ اور اس پر یقین کامل رکھتے تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اور یہ وعدہ الٰہی ہے۔ اگر کسی طرح سے وہ اس وعدہ الٰہی میں تجاوز محسُوس کرتے اور اس بات کو دیکھ پاتے کہ قرآن شریف میں کوئی تصرف اور تحریف کسی طرح سے واقعہ ہو گیا ہے تو ایسے جوانمرد راستبازی کے عاشق سچائی کے

حامی اور شیدائی کبھی خاموشی اختیار نہ کرتے لیکن ساری تواریخ کے اوراق دیکھ لو کہیں ایک حرف بھی ایسا نہ پاؤ گے کہ جس سے صراحتاً نہ سہی اشارتاً ہی اسکی تائید ہوتی ہو۔ کہیں نہیں دیکھو گے کہ صحابہؓ کی جماعت بلکہ اُنکے کسی ایک فردِ متنفس نے بھی اس وجہ پر آنحضرت صلعم کی صداقت پر حرف رکھا ہو۔ اسلامی تواریخ دوسرے مذاہب کی تاریخ کی طرح مخفی اور نایاب نہیں بلکہ نہایت مکمل اور مفصل اور معتبر تاریخ موجود ہے۔ اسلئے یہ خیال کرنا سراسر غلط اور دھوکہ دہ ہوگا کہ ایسا عظیم الشان اور اہم امر واقعہ ہوا ہو اور چھوڑ دیا گیا ہو یا وہ متاخرین کی نظروں سے ہی اُٹھا رہا ہو صحابہؓ کے حالات دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگ نہ تھے کہ اس پیشگوئی کو لطا ہرنا کام دیکھ لیتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ وہ ایسے دلیر اور سچائی کے لئے شجاع تھے کہ اگر کہیں ذرہ سا شک بھی ان کی طبیعت میں کسی امر پر پیدا ہوتا تو وہ بہت آزادی سے بیان کرتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شبہ یا وسوسہ اُن کے دلوں میں کسی وقت رہگیر ہوتا تو وہ آنحضرت سرور کائنات صلعم کے حضور میں بھی بآزادی تمام پیش کر دیتے تھے اور کبھی نہ رکتے تھے۔

واقعۂ حدیبیہ اور حضرت عمرؓ کا اعتراض

ہم انکی اس جرات ایمانی کے متعلق بطور مثال ایک واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے رؤیا میں دیکھا کہ آپ (صلعم) مع جماعت طواف بیت اللہ کر رہے ہیں چونکہ یہ رؤیا منجانب اللہ تھا۔ اسلئے چودہ سو سے کچھ زیادہ جماعت صحابہؓ لے کر آپ (صلعم) مدینہ سے مکہ معظمہ کی طرف بارادہ حج روانہ ہو پڑے لیکن جب آپ مع جماعت حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش مکہ اپنی جمعیت لے کر مقابلہ کے لئے آگئے اور مزاحم ہوئے اور کہا کہ ہم اس سے آگے تمہیں بڑھنے نہیں دینگے۔ بہت ساری قیل و قال کے بعد اس مقام پر فریقین کے درمیان صلح تجویز ہوئی جس کا نام صلح حدیبیہ ہے اِس صلح کی رُو سے نہ صرف آنحضرت صلعم کو وہیں سے مدینہ کی طرف واپس ہونا ہی پڑا بلکہ اور بھی بعض ایسی باتیں منظور کرنی پڑیں جو صحابہؓ کو ناگوار گذریں۔ یہ شرائط عام طور پر مسلمانوں پر شاق گذریں کیونکہ انہیں حج کرنے کے بغیر وہیں سے واپس جانا پڑا۔ اس پر حضرت عمرؓ حضور رسالتمآب صلعم میں حاضر ہوئے اور مسلمانوں کے خیالات کو بدیں الفاظ پیش کیا۔ فقال عمر بن الخطاب فاتیت نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقلت الست نبی اللہ حقا؟ قال بلی! قلت السنا علی الحق وعدونا علے الباطل؟ قال بلی! قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذا۔ قال انی رسول اللہ ولست اعصیہ وھو ناصری قلت اولیس کنت تحدثنا انا سنأتی البیت فنطوف بہ؟ قال بلی افاخبرتک انا ناتیہ العام قال قلت لا قال فانک اٰتیہ ومطوف بہ یعنی حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے فرمایا پس میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ یارسول اللہ کیا آپ خدا کے برحق رسول نہیں؟ آپنے فرمایا۔ ہاں بیشک میں خدا کا رسُول برحق ہوں! پھر میں نے عرض کیا کہ کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں؟ آپنے فرمایا ہاں بیشک! پھر میں نے عرض کیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسی مضر شرائط کو قبول کریں جو ہمارے دین کو نقصان پہنچانیوالی ہیں۔ اس پر آپنے فرمایا کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ میں خدا کا رسول ہوں اور میں اس کے

حکم کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے یہ نہ فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ میں پہنچیں گے اور طواف کرینگے؟ آپ نے فرمایا ہاں! لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسی سال وہاں پہنچیں گے؟ پھر میں نے جواب دیا نہیں! پھر آپ نے فرمایا کہ بیشک تم بیت اللہ میں پہنچو گے اور طواف کرو گے (بخاری کتاب الشروط) اب جائے غور ہے کہ جو جرأت اور استقلال اور ہمت خدا تعالیٰ نے حضرت عمرؓ ابن الخطاب کو عطا کی ہوئی تھی اس سے دُنیا میں کوئی شخص بیخبر نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فدائی خادم تھے وہ بھی تمام جہان کو معلوم ہے ایسا جلیل القدر انسان اپنے آقا اور مخدوم کی خدمت میں صرف اتنی بات پر اتنی بڑی جرأت سے بھرے ہوئے سوال کرتا ہے۔ اور وہ بات ہی کیا تھی صرف یہی کہ آنحضرت صلعم نے کفار مکہ کے روکنے سے حج کے ارادہ کو سال آیندہ پر ملتوی کر دیا تھا۔ اور صلح کے شرائط منظور کر کے حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ جب ہم حضرت عمرؓ کا ایمان آنحضرت صلعم پر دیکھتے ہیں اور اسی امر پر غور کرتے ہیں کہ وہ سچے دل سے آپ کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے اور مانتے تھے کہ وہ جو کام کرتے ہیں خدا ہی کے حکم سے کرتے ہیں۔ پھر ایسے ایمان کے باوجود ایسے سوالات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ لوگ حق کے لیے ایسے بہادر تھے کہ ذرا سی بات کو بھی فروگذاشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اس وقت تک صبر نہ کیا جب تک کہ اُن کی خاطر خواہ تسلی نہ ہوگئی اور امر حق اُن کو معلوم ہو گیا کہ حضور سرورِ کائنات صلعم کا رؤیا بالکل صحیح اور حق تھا۔ لیکن اس میں یہ شرط نہ تھی کہ حج اسی سال میں ہوگا بلکہ اس میں صرف حج کا وعدہ دیا گیا تھا جس کا وقت اللہ تعالےٰ ہی کو معلوم تھا۔ اور محض حدیبیہ سے لوٹ جانے اور اس سال میں حج کرنے سے قاصر رہنے سے نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ رؤیا غلط تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ ایک ہی حدیث اسبات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب کبھی کسی امر میں شُبہ یا وسوسہ پیدا ہوتا تو اُن کی عادت تھی کہ نہایت آزادی کے ساتھ اُسکو حضرت رسالت مآب صلعم کے حضور میں پیش کر دیتے۔ اور جب تک تسلی نہ ہوتی خاموش نہ ہوتے۔ اسلئے یہ یقینی بات ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک ذرہ تحریف یا تغیر و تبدل یا تصرف بھی واقعہ ہوتا تو اس پیشگوئی کی صداقت پر بہت زبردست اعتراض ان کی طرف سے وارد ہوتے۔ اور یہ ضروری تھا کہ ایسے اعتراضات آیندہ نسلوں میں بھی مشہور اور معروف ہوتے۔ لیکن تمام اسلامی کُتب میں کہیں کوئی ایسی روایت موجود نہیں اس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ کبھی کوئی وسوسہ قرآن کریم کی تحریف و تصرف کی بابت پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور اس سے یہ بات صریح طور سے ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف ہر قسم کے تصرفات و تحریفات و تغیرات سے پاک رہا ہے اور جس طرح آنحضرت صلعم سے صحابہؓ نے سیکھا تھا۔ اسی طرح بلا کم و کاست آج تک موجود ہے۔ جس سے اس پیشگوئی کا منجانب اللہ ہونا اور اس کی صداقت ثابت ہے +

رفع قرآن کا مطلب

مصنف تاویل القرآن نے محض بے سمجھی سے ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مطلب اس نے یہ لکھا ہے کہ قرآن شریف پر ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ جب یہ سب کا سب اُٹھا لیا جائیگا یہانتک کہ ایک آیت بھی باقی نہ چھوڑی

جائیگی ۔ اور پھر اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جبکہ یہ جائز ہے کہ سارا قرآن شریف دنیا سے اُٹھ جائے اور ایک آیت بھی اسکی روئے زمین پر باقی نہ رہے تو پھر بھی وعدہ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون میں کچھ فرق نہیں آسکتا تو پھر اگر قرآن شریف کا کوئی حصہ گم ہو جائے یا اس میں کوئی تصرف اور تحریف کر لی جائے تو اس وعدہ حفاظت میں کیونکر فرق آنا جائز تسلیم ہو سکتا ہے ۔ اول تو اس معترض نے اتنا بھی نہیں سمجھا کہ ابن ماجہ مسلمانوں میں اُن کتب میں سے نہیں مانی جاتی جن کی سند پر ان کو سب سے اول درجہ پر ایمان ہے مسلمان اسکی روایات کو قرآن شریف کی آیات اور صحیح بخاری وغیرہ کی صحیح احادیث پر حاکم نہیں سمجھتے ۔ قرآن شریف کے وعدہ کے مقابلہ میں ایسی بات کو لکھ کر اپنے اس دعوے کی تائید کرنا کہ حفاظت الذکر سے قرآن شریف کی حفاظت مراد نہیں راقم کی مطلق حماقت اور بے سمجھی پر دلیل بین ہے ۔ ماسوائے اسکے قرآن شریف کے اُٹھائے جانے سے مراد یہ نہیں کہ اسکی عبارت اور الفاظ کسی زمانہ میں دنیا سے اُٹھا لئے جائیں گے ۔ یہ تو نہایت لغو تعبیر ہے اس کا صاف مطلب یہی ہے ۔ کہ مغز قرآن جہان سے اُٹھ جائیگا یعنی ایک زمانہ ایسا آئیگا ۔ کہ جب لوگوں کی زبان پر قرآن ہوگا مگر ان کی عملی زندگیوں سے وہ خارج ہوگا ۔ بخاری اور مسلم میں جو احادیث صحیحہ اس مضمون پر آئی ہیں ان سے صاف پایا جاتا ہے ۔ کہ علم قرآن علما کے نہ ہونے کی وجہ سے قبض کر لیا جائیگا نہ کہ اس کے الفاظ قبض کر لئے جانے کی وجہ سے ۔ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب العلم میں یہ حدیث آئی ہے ۔ عن عبد اللہ ابن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلماء ۔ یعنی عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ علم کو لوگوں میں سے چھین کر نہیں لیجائیگا بلکہ علماء کے قبض کرنے سے علم قبض کریگا ۔ ایسا ہی بیہقی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب اسلام سے کچھ نہ رہیگا مگر صرف اس کا نام ۔ اور قرآن سے کچھ نہ رہیگا مگر اس کے الفاظ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب العلم میں یہ حدیث آئی ہے ۔ عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یاتی علی الناس زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمه ولا یبقی من القرآن الا رسمه مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدی علماؤهم شر من تحت ادیم السماء من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود ۔ یعنی حضرت علی رض سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ جب اسلام میں سے کچھ نہ رہیگا مگر اس کا نام ۔ اور قرآن میں سے کچھ نہ رہیگا مگر اس کے الفاظ ۔ ان کی مسجدیں معمور ہونگی لیکن ہدایت کے نہ ہونے کے سبب سے حقیقت میں ویران ہونگی ۔ اور ان کے علماء بگڑ کر ایسے خراب ہو گئے ہونگے کہ پردۂ آسمان کے نیچے اُن سے بڑھ کر بُرا کوئی نہ ہوگا ۔ اُن سے ہی فتنہ نکلیگا اور انہیں میں عود کر کے داخل ہوگا +

اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن اُٹھائے جانے سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ گویا جس قدر قرآن لوگوں کے گھروں میں لکھے اور چھپے پڑے ہیں یا جس قدر قرآن کتب خانوں اور دکانوں اور مسجدوں اور مقدس مقامات میں موجود ہیں وہ سب

سب کسی روز دُنیا سے اُٹھا لیئے جاوینگے۔ اور جن لوگوں نے بڑی محنتوں سے اس کو کلاً یا جزاً حفظ کیا ہوا ہے اُن کے حافظوں سے بھی اسکو سلب کر دیا جائیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی عبادات بھی دُنیا سے معدوم ہوجائینگی اور اس وجہ سے اسلام ہی دُنیا سے رخصت ہوجائیگا ایسا کبھی ممکن نہیں اور نہ ہی حدیث ابن ماجہ کی منشا ہوسکتی ہے۔ خدا تعالیٰ تو اپنے اس دین قویم کو ابدالآباد تک زندہ رکھیگا مصنف تاویل القرآن کے بُرا ماننے اور اپنے دل کی معاندانہ ہوائی امنگوں کو اس رنگ میں بیان کرنے سے کیا ہوسکتا ہے کاش وہ حدیث ابن ماجہ کے ان الفاظ کا مطلب سمجھنے کے لیئے اپنے ناقص علم پر ہی حصر نہ کرتا بلکہ اگر انصاف اور حق پژوہی سے اُسے غرض تھی تو کسی واقفکار سے پُوچھ لیتا۔ اور مذکورہ بالا احادیث کے سوا ترمذی۔ احمد حنبل۔ اور دارمی سے اسی امر کی شہادت لے لیتا۔ تو پھر اسکو اچھی طرح معلوم ہوجاتا کہ تمام محدثین کا اس کے کونسے معنوں پر اتفاق ہے۔ اور کون شخص مُصنّف تاویل القرآن کے ساتھ متفق ہے مشکوٰۃ کتاب العلم میں ایک حدیث لکھی ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے عن زیاد بن لبید قال ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم شیئاً فقال ذاك عند اوان ذھاب العلم۔ قلت یا رسول اللہ کیف یذھب العلم ونحن نقرء القرآن ونقرئ ابناء نا ویقرئہ ابناء نا ابناء ھم الی یوم القیامۃ فقال ثکلتك امك زیاد ان کنت لاراك من افقہ رجل بالمدینۃ اولیس ھذہ الیھود والنصاریٰ یقرءون التوراۃ والانجیل لا یعملون بشئ مما فیھا یعنی زیاد بن لبید سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کسی امر کے واقعہ ہونے کے متعلق فرمایا کہ وہ علم کے گم ہوجانے کے زمانہ میں واقعہ ہوگا میں نے اس پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ علم مفقود ہوجائیگا جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں۔ اور ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائیگی اور یہ سلسلہ روز قیامت تک چلا جائیگا۔ یہ بات سُنکر آنحضرت صلعم نے فرمایا اے زیاد! تیری ماں تجھ سے محروم ہوجائے! میں تو سمجھتا تھا کہ مدینہ میں تو ایک بڑا دانا آدمی ہے۔ کیا یہ یہود اور نصاریٰ تورات و انجیل کو نہیں پڑھتے لیکن وہ اُن کی کسی بات پر عمل نہیں کرتے۔" اب اس حدیث سے ہمارے مقصود پر اور بھی زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ کہ جب آنحضرت صلعم نے بیان فرمایا کہ کسی زمانہ میں علم گم ہوجائیگا تو معاً ایک صحابی نے خیال کر کے کہ علم کے معنے صرف پڑھنے پڑھانے کے ہیں عرض کیا کہ جبکہ ہم خود قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اپنی اولاد کو پڑھاتے ہیں اور ہماری اولاد میں یہ سلسلہ تعلیم و تعلم قرآن شریف تا قیامت جاری رہیگا تو پھر علم گم کیونکر ہوجائیگا چنانچہ اسکی تشریح خود آنحضور صلعم نے یہود اور نصاریٰ کی مثال پیش کر کے فرمادی یعنی علم سے مُراد یہ نہیں کہ کتاب الٰہی کو طوطے کی طرح پڑھتے رہیں بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اور علم گم ہونے سے یہی مطلب ہے کہ گویا لوگوں میں سے عمل قرآن اُٹھ جائیگا نہ کہ اسکے الفاظ اور عبارات +

حفاظت قرآن اور حفاظت آنحضرت کے دو وعدے

جو باتیں اوپر لکھی جاچکی ہیں اُن سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آیت انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون کے یہی معنے سمجھتے تھے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وہ

قرآن کریم کو اُن ہر قسم کے تصرفات اور تحریفات سے محفوظ رکھیگا جو پہلی کتابوں کی تباہی کا موجب ہوئے۔ کوئی انسان کسی طرح سے اس میں سے نہ کچھ نکال سکیگا اور نہ اس میں ایک نقطہ بڑھانے پر قادر ہو سکیگا بجنسہٖ جیسا کہ نازل ہوا ویسا ہی تا قیامت موجود رہیگا۔ اور اس اہم اور زبردست وعدہ آلہی کے متعلق کسی نے کبھی کوئی ذرا سا وسوسہ بھی پیش نہ کیا۔ آج تک جو کتنی صدیاں گذر چکی ہیں بجنسہٖ وہی قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوا تھا اور جس طرح آپ نے اپنے صحابہؓ کو تعلیم کیا تھا۔ اس میں ایک سرمو کا فرق نہیں ہوا۔ ایک طرف اس زبردست وعدہ کا وجود اور دوسری طرف تاریخ کی سچی شہادت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن شریف میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہونے پایا اور اسکی تحریف و تبدیل ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہوئی۔ ان صریح شہادتوں کے علاوہ اور بھی بہت ساری باتیں ایسی ہیں جن سے یہ بات بطور نتیجہ ثابت ہوتی ہے بطور مثال اس جگہ ہم ایک امر کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ اُسی زمانہ میں جب قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی وعدہ دیا گیا تھا کہ یا یھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته واللہ یعصمك من الناس ترجمہ۔ اے رسول! جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے اُترا ہے وہ لوگوں کو پہنچا دو۔ کیونکہ اگر تم اس کی تبلیغ نہ کروگے تو سمجھا جائیگا کہ تم نے اپنا منصب پیغام رسانی پورا نہیں کیا اور اللہ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھیگا۔ اس قسم کا وعدہ اور بھی بہت ساری آیات میں پایا جاتا ہے پس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ایک وعدہ آلہی تھا کہ تمہارے دشمنوں کے برے خیالات اور گندے منصوبوں اور ظالمانہ حملوں سے تمہاری حفاظت ہم خود کرینگے! ور اسی زمانہ میں حفاظت قرآن کا وعدہ بھی ہوا تھا۔ اور دونوں وعدے ایک ہی زبردست اور بے عیب ہستی کی طرف سے تھے جو تمام جہان کا مالک و خالق ہے۔ پہلے وعدہ کے پورا ہونے کا تعلق تو آنحضرت صلعم کی زندگی تک ہی تھا! ور دوسرے وعدہ کی ایفاء آپ کی وفات کے بعد سے شروع ہونے والی تھی۔ آنحضرت صلعم کے کام کو دو خطرناک خطرات کا سامنا تھا۔ اوّل یہ کہ آپ دشمنوں کے منصوبوں اور حملوں کا شکار ہو کر قتل ہو جاتے۔ سو اگر یہ واقعہ اس طرح ہوتا تا تو پھر آپ کا سارا کاروبار اور تمام سلسلہ اور کتاب آلہی جو آپ پر نازل ہو رہی تھی ناقص اور ناتمام رہ جاتے اور دوسرا خطرہ یہ تھا کہ آپ کی وفات کے بعد اس مقدس کتاب میں بھی پہلی کتابوں کی طرح انسانی تصرفات سے تحریف و تبدل واقعہ ہو جاتا اور اس طرح اسلام تباہ ہوتا۔ آپ سے پہلے بعض انبیا کو لوگوں نے قتل بھی کر ڈالا تھا۔ اور وہ کتابیں جو آپ سے پہلے انبیاء پر لوگوں کی ہدایت کے لیئے نازل ہوئی تھیں وہ اُن کے بعد محرف و مُبدّل ہو گئیں لیکن اللہ تعالےٰ نے آنحضور صلعم کی رسالت کے کام کو ان دو وعدوں سے نہایت مکمل کر دیا۔ ان کی جان کی حفاظت ایسی کر دکھائی کہ باوجود دشمنوں کی اس قدر زور آوری اور جمعیت اور قوت کے اور باوجود آنحضور کی جمعیت کی قلت اور کمزوری کے خدا تعالےٰ نے آپ کو ہر ایک حملہ و منصوبہ سے بچائے رکھا۔ اور کسی قاتل و غاصب کا اُن پر کوئی حملہ و منصوبہ پیش نہ جا سکا۔ جب انصاف اور غور سے اس زمانہ کے حالات پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم

ہوتا ہے کہ اس وعدہ کا پورا ہونا کتاب کی حفاظت کے وعدے کے ایفا سے بہت مشکل تھا۔ لیکن اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہ وعدہ بلا کم و کاست پورا ہو چکا۔ مکہ میں بھی مخالفوں نے طرح طرح کے منصوبوں سے آنحضرت صلعم کی جان پر حملے کیے اور مدینہ میں بھی آپ کو قتل کرنے کے منصوبے کیے گئے لیکن وہ سب میں ناکام و نامراد رہے۔ جب اس ایک وعدہ کا پورا ہونا اپنی آنکھوں کے سامنے صحابہ رضوان نے دیکھ لیا کہ خدا تعالیٰ نے کیسی حکمتوں سے دشمنوں کو ان کے منصوبوں اور حملوں میں پسپا کیا۔ اور ایک تنہا اور بیکس یتیم کی اس قدر مخالفتوں اور زبردست منصوبوں اور حملوں کے مقابلہ میں کس طرح جان بچائی اور اس کا کام پورا کرایا تو ان کا یقین اور ایمان اس بات پر اور بھی زیادہ ہو گیا کہ ایسا زبردست خدا دوسرا وعدہ بھی ضرور پورا کریگا۔ چنانچہ وہ بھی آج تک پورا ہوتا رہا۔ اور اسی طرح ہوتا رہیگا۔ اور ان وعدوں کے پورا ہونے سے اسلام کے منجانب اللہ ہونے کا بین ثبوت ملتا ہے۔ اسکے بعد اب میں ان اسباب کو بیان کرونگا جو قرآن کریم کی حفاظت کا ذریعہ بنے۔ مگر اس پہلے حصہ کے خاتمہ پر ایک بات کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ توریت کے متعلق اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ تم نے اسے نہ گھٹانا اور نہ بڑھانا مگر شریعت میں جس قدر احکام انسانوں کو دیئے گئے بعض نے انکی خلاف ورزی بھی کی۔ اور یہ ایک مسلّم امر ہے۔ ایسا ہی توریت کی حفاظت بھی چونکہ خدا نے انسانوں کے سپرد کی اسلیئے احکام شریعت کی طرح ضروری تھا کہ اس میں گھٹا یا بڑھایا جاتا اور تحریف بھی ہوتی۔ مگر قرآن شریف کی حفاظت کو خدا تعالےٰ نے کسی انسان کے سپرد نہیں کیا بلکہ وہاں حفاظت کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ اور یہی فرمایا کہ ہم خود ہی اُس کی حفاظت کرینگے جس سے الٰہی منشاء صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں کسی قسم کی تحریف یا تغیر تبدل دخل نہ پائے۔

(۲) وہ دلائل جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کُل قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھا گیا تھا

قرآن کی ہر آیت آنحضرت صلعم کے سامنے لکھی گئی

اب جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی کہ آیت کریمہ انّا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحٰفظون وغیرہ میں خدا تعالیٰ نے جو وعدہ حفاظت الذکر کا کیا ہے وہ صرف قرآن شریف ہی کی حفاظت کے متعلق ہے اور اس کے سوائے کسی دوسرے نبی کی کوئی کتاب اس وعدہ میں شامل نہیں۔ اور تمام مسلمانان سابقین و متاخرین کا بلا اختلاف یہی اعتقاد رہا ہے تو اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا ہوا۔ اسلیئے اس جگہ ہم وہ ظاہری اسباب بیان کرتے ہیں جو خدا تعالےٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیئے پیدا کر دیئے تھے۔ سب سے پہلے اور نہایت ضروری بات یہ تھی کہ جس شخص پر یہ کلام الٰہی نازل ہوتا تھا اسکے سامنے ہی ضبط تحریر میں بھی آ جائے تا بعد میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو۔ چنانچہ جب کوئی حصہ قرآن شریف کا نازل ہوتا تھا اسی وقت اسکو حضور سرور کائنات

صلے اللہ علیہ وسلم لکھوا دیتے اور مشہر کرا دیتے اور اکثر صحابیوں کو حفظ کرا دیتے۔ یہاں تک کہ اس انتظام کے ساتھ سارے کا سارا قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی زیر حفاظت اور زیر نگرانی لکھا گیا۔ اگرچہ اہل عرب میں قوت حافظہ بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور ہزار ہا اشعار اور بڑے بڑے نسب نامے زبانی یاد رکھنا ان میں عام طور پر مروج تھا مگر رسم تحریر ان میں اسلام سے پہلے موجود تھی۔ اور بعض وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کبھی کوئی شاعر اعلے درجہ کی نظم کہتا یا کوئی اعلے درجہ کا قصیدہ کہتا تو اُسے لکھ کر کسی نمایاں پبلک مقام پر معلّق کر دیتا کہ اُسے اسکے ہموطن دیکھ سکیں اور اسکی تعریف کریں۔ چنانچہ مشہور مُعلّقات جو آج تک سبعہ مُعلقہ کے نام سے موسوم ہیں اسطرح لٹکائے گئے تھے۔ عربی زبان میں سبعہ سات کو کہتے ہیں اور ان کو سبعہ معلّقہ اسلیئے کہتے ہیں کہ دراصل یہ سات نظمیں ہیں جو سات مختلف شعراء زمانہ جاہلیت کی کہی ہوئی ہیں۔ جن کو یکے بعد دیگرے ان کے مصنفوں نے لکھ کر کعبہ کی دیوار پر معلّق کر دیا۔ جہاں بہت عرصہ تک وہ لٹکی رہیں +

سیور کی شہادت

بہت سے واقعات جو احادیث کے ذریعہ سے محفوظ ہو کر ہم تک پہنچے ہیں ثابت کر رہے ہیں کہ سارا قرآن شریف حضور فخر موجودات سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ضبط تحریر میں آ چکا تھا۔ بلکہ خود قرآن شریف میں ہی بہت سے ایسے حوالے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسی زمانہ میں لکھا بھی گیا تھا لیکن قبل اس کے کہ ہم ان دو ذرائع شہادت کے متعلق کچھ ذکر کریں ہم سر ولیم میور کی لائف آف محمد کے دیباچہ کے صفحہ ۲۸ سے ذیل کی عبارت کا اقتباس کرتے ہیں جس میں عیسائی مصنف نے اسبات کا اقرار کیا ہے کہ اس امر کی شہادت کثرت سے موجود ہے کہ قرآن شریف حضور رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلعم کی آنکھوں کے سامنے لکھا جا چکا تھا۔ اور یہ ایسی زبردست شہادت ہے کہ جس کو قبول کرنے سے اسلام کے ایسے خطرناک مخالف کو بھی گریز کی جگہ نہ مل سکی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "لیکن اس بات کو ماننے کیلیئے بہت زبردست وجوہ موجود ہیں کہ (حضرت) رسول (کریم صلعم) کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن شریف کے نسخے لکھے ہوئے صحابہؓ کے پاس موجود تھے اور ان نسخوں میں سارا قرآن یا قریباً سارا لکھا ہوا موجود تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ (حضرت) محمد (مصطفےٰ صلعم) کے دعوئے نبوت سے بہت پہلے مکّہ میں فن تحریر مروج تھا۔ اور مدینہ میں جا کر تو خود پیغمبر (خدا صلعم) نے اپنے مراسلات لکھوانے کے لیئے کئی صحابی مقرر کیئے ہوئے تھے۔ جو لوگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تھے انہیں اس شرط پر رہائی دیا گیا تھا کہ وہ بعض مدنی آدمیوں کو لکھنا سکھلا دیں۔ اور اگرچہ اہل مدینہ اہل مکّہ کے برابر تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن وہاں بھی بہت ایسے لوگ موجود تھے جو اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے" +

ن لکھا جانے پر ندرونی ہادت

خود قرآن شریف میں بھی بہت صفائی سے اس امر کی شہادت موجود ہے کہ یہ اُس وقت لکھا ہوا موجود تھا۔ پہلے تو لفظ کتاب ہی قابل غور ہے جو بار بار مختلف سورتوں میں قرآن کریم کی نسبت آیا ہے۔ اور کتاب کے معنے لکھے ہوئے کے ہیں۔ ایسا ہی قرآن شریف کو صحف بھی کہا گیا ہے۔ اور صحیفہ کے معنے لکھے ہوئے کاغذ کے ہیں۔ چنانچہ سورۃ البیّنہ میں ہے رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ فیھا کتب قیمۃ یعنی اللہ کا رسول مقدس اوراق پڑھ کر

گُھاتا ہے جن میں مضبوط کتابیں موجود ہیں۔ اب یہ اوراق مقدس قرآن شریف کے اوراق ہیں اور کتب قیمہ اسکی سورتیں ہیں کیونکہ نہ صرف کامل قرآن شریف ہی کو الکتاب کہا گیا ہے بلکہ اسکی ہر ایک سورۃ کو بھی کتاب کا نام دیا گیا ہے ایسا ہی سورۃ عبس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کلا انھا تذکرۃ فمن شاء ذکرہ۔ فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطھرۃ۔ بایدی سفرۃ۔ کرام بررۃ۔ ترجمہ۔ قرآن تو (سراسر) نصیحت ہے پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے اور (وہ قرآن) اوراق میں (لکھا) ہے جن کی تعظیم کی جاتی ہے (اور وہ) اونچی جگہ رکھے ہوئے (ہیں اور) پاک (ہیں) (اور ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں (رہتے ہیں) جو بزرگ (اور) نیکوکار ہیں۔ لفظ صحف جو یہاں استعمال ہوا ہے وہ صحیفہ کی جمع ہے۔ اور یہی لفظ ہے جو ان تمام مجموعوں کیلئے بولا جاتا ہے جو حضرت زید بن ثابت نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع کئے تھے پس یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ خود قرآن کریم نے اپنے لئے لفظ کتاب اور صحیفہ استعمال کئے ہیں۔ اور ان دونوں لفظوں کے عربی زبان میں لکھی ہوئی کتاب معنے ہیں۔ جو ہر ایک لغت عرب سے ثابت ہے۔ اور آج تک عام طور پر لفظ مُصحف کا قرآن کریم کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور وہ بھی صحیفہ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے معنے ایک کتاب ہیں جسمیں بہت سے صحیفے جمع ہوں یعنی لکھے ہوئے اوراق ہوں ٭

قرآن شریف کے دیگر مقامات سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اسکی سورتیں ابتدائی زمانہ میں ہی لکھی ہوئی تھیں چنانچہ سورۃ الواقعہ میں جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی نسبت فرماتا ہے انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون۔ لا یمسہ الا المطھرون یعنی یہ (قرآن) بڑی قدر و منزلت کا قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا۔ اُسے چھوتے نہیں مگر جو پاک ہیں۔ ان آیات سے دو باتیں پایہ ثبوت کو پہنچتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جسے کوئی محرف مُبدّل نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ قرآن کریم اسی ابتدائی زمانہ میں لکھا جا چکا تھا کیونکہ ناپاکوں کو اسے چھونے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی موٹی بات ہے کہ مس کرنے کے لئے کسی شے کا وجود جسمانی رنگ میں ہونا ضروری ہے الفاظ کا مس نہیں ہو سکتا۔ اگر وہی الفاظ ضبط تحریر میں آ کر کتاب کی صورت بن جائیں تو وہ ایک جسم بن جاتا ہے اور چھوا جا سکتا ہے اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم اسی ابتدائی زمانہ میں لکھا جا چکا تھا اور کتاب کی صورت میں تھا۔ اگر یہ لکھا ہوا نہ ہوتا تو اس پر لفظ مس کا اطلاق ہی نہ ہوتا۔

راڈول ایک یورومین ہے جس نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اس نے اپنے انگریزی ترجمہ میں اس موقعہ پر مفصلہ ذیل حاشیہ دیا ہے"۔ اس جملہ سے کم از کم اتنا تو پتہ ملتا ہے کہ قرآن شریف کی سورتوں کے لکھے ہوئے نسخے اس وقت عام طور پر زیر استعمال تھے حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ فرماتی ہیں کہ جب وہ مسلمان ہونے لگے تو انہوں نے مجھے کہا کہ سورۃ طٰہٰ کا نسخہ میرے ہاتھ میں دیدو۔ آیات ۷۷۔ ۸۰ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ بحکم خلیفہ محمد ابوالقاسم بن عبداللہ قرآن کریم کی تمام جلدوں پر لکھی جانی شروع ہوئیں" (دیکھو ترجمہ قرآن راڈول صفحہ ۴۵) یہ بات صحیح نہیں کہ اس جملہ سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کے صرف بعض حصے ہی لکھے گئے تھے اس عبارت سے

کوئی حصہ قرآن کا ایسا نہیں جو لکھا نہ گیا ہو

٭ یہ ظاہری معنی اس آیت کے ہیں اور ان معنوں کو اختیار کرنے سے دوسرے معنوں کا انکار لازم نہیں آتا۔ منہ

کسی طرح نہیں پایا جاتا کہ کوئی حصہ قرآن شریف کا ایسا بھی رہ گیا تھا کہ جو لکھا ہی نہ گیا ہو۔ اس میں صاف لکھا ہے کہ سارا قرآن لکھی ہوئی کتاب تھی نہ کہ بعض حصے اس کے لکھنے سے رہ گئے یا چھوڑے گئے تھے۔ پس ان آیات میں شہادت صریح طور پر موجود ہے کہ سارا قرآن شریف لکھا ہؤا تھا۔ اور اگر کوئی شخص اس کے برخلاف یہ کہے کہ بعض حصے لکھے ہوئے تھے اور بعض نہیں تو اُس کا فرض ہے کہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے اس کے مخالف شہادت پیش کرے لیکن سارے قرآن کریم اور ساری احادیث شریفہ میں کہیں اس قسم کی مخالف شہادت کا ایک شمہ بھی نہیں پایا جاتا۔ بلکہ تمام مسلمان قرآن شریف کے ہر ایک لفظ کی برابر ہی تکریم و تعظیم کرتے اور اس کے منجانب اللہ منزل ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اسلئے ایسا گمان کرنا کہ کوئی حصہ اس کا لکھا گیا تھا اور کوئی نہ لکھا گیا تھا سراسر نادانی اور نا معقولیت ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں کہیں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں نظر آتا کہ جس سے یہ نتیجہ نکالنے کا کسی کو حق پہنچ سکے کہ قرآن شریف کی بعض سُورتوں کو بعض سے متفاوت اور مختلف سمجھا جا سکے۔ اور یہ خیال کیا جا سکے کہ بعض سُورتیں لکھی گئی تھیں اور بعض کو اس لائق نہیں سمجھا گیا تھا۔ کہ وہ لکھی جاتیں یا یہ کہ ساری سُورتوں کی مساوی احتیاط نہیں کی گئی یا یہ کہ قرآن شریف کے ہر ایک لفظ کی حفاظت کے لئے مساوی خواہش آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اور بزرگانِ دین نے نہ کی تھی بعض کی کی اور بعض کی نہ کی یا کچھ کم کی۔ قرآن شریف خود فرماتا ہے کہ وہ ایک کتاب ہے مقدس اوراق میں لکھی ہوئی ہے۔ جسے پاکوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ اور یہ الفاظ قرآن کریم کے ہر ایک لفظ کے متعلق ہیں۔ نہ کسی خاص حصہ یا خاص سُورت کے متعلق +

کفار سے تحدی میں قرآن کے لکھے جانے کی شہادت

ماسوائے اسکے ایک اور دلیل جو قرآن شریف کے لکھا ہوا ہونے پر خود قرآن کریم سے ہی ملتی ہے یہ ہے کہ کُفار مکہ کہتے تھے کہ یہ قرآن گویا (نعوذ باللہ منہا) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی بنا لیا ہؤا ہے۔ خدا کی طرف سے وحی نہیں ایسے لوگوں کو چیلنج کیا گیا تھا۔ ام یقولون افترٰہ۔ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین یعنی (اے پیغمبر) کیا (کافر) کہتے ہیں کہ اس (شخص یعنے تم) نے قرآن کو اپنے دل سے بنا لیا ہے تو (ان لوگوں سے) کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم بھی (اہل زبان ہو) اسی طرح کی بنائی ہوئی (زیادہ نہیں) دس (ہی) سورتیں لے آؤ اور خدا کے سوا جس کو (مدد کے لئے) تم سے بُلاتے بن پڑے بلا لو"۔ یہ آیتیں سورۃ ہود میں ہیں۔ اور سورہ ہود مکہ میں اس وقت نازل ہوئی جبکہ ابھی ہجرت بھی نہ ہوئی تھی ایسے ہی سُورہ بنی اسرائیل جو اس سے بھی پہلے کی نازل شدہ ہے اسکی ۹۱ آیت میں یہ چیلنج درج ہے۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن علٰی ان یاتوا بمثل ھٰذا القراٰن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا یعنی (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اگر آدمی اور جن جمع ہو کر (اس بات پر آمادہ) ہوں کہ اس قرآن کی طرح کا (اور کلام) بنا لائیں تو وہ کبھی اُس جیسا نہیں بنا لا سکتے اگرچہ ان میں سے ایک کی پشتی پر ایک (کیوں نہ ہو"۔ پھر سورۃ البقرہ کی آیات ۲۱-۲۲ میں یہ تحدی درج ہے۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علٰی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا

فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکفرین یعنی اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر (قرآن) اُتارا ہے۔ اگر تم کو اس میں شک ہو (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورۃ (تم بھی بنا) لاؤ۔ اور اللہ کے سوا جو (تمہاری حمایت کو) آموجود ہوں اُن کو بھی بُلا لو پس اگر (اتنی بات بھی) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو (دوزخ کی) آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہونگے جو منکروں کے لیئے تیار ہے"۔ یہ آیت مدنی ہے۔ اب ان مکی اور مدنی سورتوں میں کہیں یہ چیلنج ہے کہ اس قرآن جیسی دس سورتیں بنا لاؤ اور کہیں یہ تحدی ہے کہ ایک ہی سورۃ اس کے مقابلہ میں بنا لاؤ۔ اِن باتوں سے صاف طور پر عیاں ہو رہا ہے کہ قرآن شریف کی سورتیں ان تحدیوں کے وقت لکھی ہوئی تیار تھیں۔ کیونکہ سورتیں لکھی ہوئی موجود نہ ہوتیں تو ایسا چیلنج بے معنی ہوتا۔ کیونکہ ضروری ہے کہ جس چیز کا مقابلہ کرنے کے لیئے کسی کو تحدی کی جائے تو وہ چیز بھی اسکے سامنے رکھی جائے ورنہ وہ مقابلہ ہی کیا کر سکتا ہے اور اگر قرآن شریف کی سورتیں لکھی ہوئی موجود نہ ہوتیں تو یقیناً کفار کی طرف سے یہی جواب دیا جاتا کہ پہلے ہمیں وہ سورتیں تو دکھاؤ جن کا مقابلہ چاہتے ہو +

احادیث کی شہادت کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت آنحضرؐ نے اپنے اپنے موقع پر لکھوائی

قرآن شریف کی شہادت کے علاوہ اعلےٰ طبقہ کی صحیح احادیث میں بہت سارے واقعات ایسے درج ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی ہوتی تھی تو وہ اسی وقت لکھ لی جاتی تھی۔ کثرت سے احادیث پائی جاتی ہیں جن میں صراحت سے یہ ذکر ہے کہ قرآن کریم کی ہر ایک آیت یا سورہ جیسے کہ وہ نازل ہوتی فوراً اسی وقت حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھ لیجاتی۔ چنانچہ حدیث ذیل میں حضرت عثمانؓ نے قرآن شریف کی آیات کے لکھے جانے کا طریق بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ ایسے اوقات میں جب آپ پر چند سورتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوتی رہتی تھیں جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ان شخصوں میں سے جو قرآن کریم کو لکھا کرتے تھے کسی ایک کو بُلا بھیجتے اور اسکو فرما دیتے کہ یہ آیت فلاں سورۃ میں جہاں ایسا ایسا ذکر ہے لکھو" فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹۔ اِس حدیث کے متعلق لکھا ہے۔ روی احمد و اصحاب السنن الثلثۃ وصححہ ابن حبان والحاکم من حدیث عبد اللہ بن عباس عن عثمان بن عفان قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان ینزل علیہ من السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیہ الشئ یدعو بعض من یکتب عندہ فیقول ضعوا ھذا فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا۔ اِس حدیث سے یہ نہیں پایا جاتا کہ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح صرف ایک ہی دفعہ عمل کیا۔ بلکہ اِس بات کا کھلے طور سے بیان ہے کہ آپ کا ہمیشہ یہی عمل تھا کہ جب کبھی کوئی آیت یا سورۃ نازل ہوتی تو کسی کاتب الوحی کو بُلوا کر فوراً لکھوا دیتے جو شخص اِس عمل حضرت رسالت پناہ صلعم کی روایت کرتا ہے وہ حضرت عثمانؓ جیسے جلیل القدر صحابی ہیں جو ابتدائی زمانہ میں ہی اسلام لا چکے ہوئے تھے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت قریبی رشتہ بھی رکھتے تھے

یعنی آپ کے داماد بھی تھے۔ پس یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ ہر ایک سورۃ قرآن شریف کی اور ہر ایک آیت قرآن شریف کی آنحضرت صلعم کے حکم و ہدایت سے آپ کے سامنے اُسی وقت لکھ لیجاتی جبکہ وہ نازل ہوتی۔ اور مزید احتیاط آپ یہ فرماتے کہ جب کبھی دو یا دو سے زیادہ سورتیں ابھی غیر مکمل ہوتیں تو جس مقام اور سورۃ اور موقع پر وہ آیت لکھنی چاہئیے تھی اسی جگہ لکھنے کی ہدایت فرماتے تاکہ کاتب ایک سورۃ کی آیات کو کسی دوسری سورۃ کی آیات سے مخلوط نہ کر سکیں۔ ایک طرف تو قرآن کریم کے لکھا جانے کے متعلق ایسی زبردست شہادت موجود ہے اور دوسری طرف اس کے نہ لکھا جانے کے متعلق کوئی کمزور سے کمزور روایت بھی پیش نہیں کیجاتی۔ ان تمام امور سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ سارے کا سارا قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی لکھا گیا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اس امر پر اکیلی ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت ساری روایات صحیح احادیث میں ایسی موجود ہیں جو اس گواہی کی تائید کرتی ہیں مثلاً بخاری باب کاتب النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں برا کی روایت سے یہ حدیث ہے قال لما نزلت لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاھدون فی سبیل اللہ قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم ادع لی زیدا ولیجئی باللوح والدواۃ والکتف او الکتف والدواۃ ثم قال اکتب لا یستوی القاعدون یعنی جب آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاھدون فی سبیل اللہ (سورۃ النساء، آیت ۹۵) نازل ہوئی تو حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید کو میرے پاس بلا لاؤ اور کہو کہ دوات اور لوح ساتھ لائے پھر جب وہ آپہنچا تو اُسے حکم دیا کہ لا یستوی الخ ساری آیت لکھو۔ ایسے ہی بخاری کے اسی باب میں ایک اور حدیث آئی ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زید کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انک کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یعنی بیشک تو آنحضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا۔ اس کرم عُہدہ کتابت وحی پر حضرت

کاتبانِ وحی

زیدؓ تو مامور ہی تھے اور اس ماموریت کی وجہ سے کثیر حصہ مدنی وحی کا انہوں نے ہی لکھا تھا لیکن ان کے سوا اور بھی وحی نبوت لکھنے والے اصحاب موجود تھے جنہوں نے مکی سورتیں مکہ میں لکھیں اور بعض مدنی آیات کو جب کبھی حضرت زید موجود نہ ہوتے تو ان کی غیر حاضری میں اوروں نے لکھا۔ ان معظم اور مقدس بزرگوں کے اسماء کی فہرست میں حضرت ابوبکر صدیق۔ حضرت عثمان۔ حضرت عمر۔ حضرت علی۔ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح (جو ایک وقت میں مرتد بھی ہو گیا تھا اور فتح مکہ کے بعد پھر مسلمان ہوا تھا) حضرت زبیر بن عوام۔ حضرت خالد و ابان ابنائے سعید۔ ابی بن کعب۔ حنظلہ بن الربیع معیقیب بن ابو فاطمہ۔ عبد اللہ بن ارقم۔ شرحبیل بن حسنہ۔ عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹ باب کاتب وحی رسول اللہ۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ آنحضرت صلعم کے اصحاب میں صرف اتنے ہی لکھے پڑھے لوگ تھے۔ اور صرف انہوں نے ہی قرآن شریف کی نقلیں بھی کیں۔ یہ تو صرف ان لوگوں کے نام ہیں جن کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وحی لکھنے کیلئے بُلا لیا کرتے تھے۔ اور جن کے نام کاتبان وحی کی حیثیت سے احادیث میں موجود ہیں۔ مگر احادیث میں بھی اُن سب

بزرگوں کے اسماء درج نہیں جو وحیٔ نبوت کی کتابت کا کام کرتے تھے۔ بلکہ صرف چند نام درج ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین ان احادیث سے یہ بات صریح طور سے ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اُسی وقت ضبط تحریر میں لائی جاتی تھی جس وقت نازل ہوتی تھی لیکن ان کے ماسوا بہت سارے ایسے واقعات موجود ہیں۔ جو دوسرے طور پر

احادیث کے تحریر میں لانے کی ممانعت

اس ثبوت کو اور بھی مضبوط کرتے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن یعنی مجھ سے سوائے قرآن کے کوئی شے مت لکھو۔ یہ ہدایت اس غرض سے احتیاطاً حفظ ماتقدم کے طور پر دی گئی تھی کہ قرآن شریف کے ساتھ حضور سرور کائنات صلعم کی اپنی باتیں کہیں لوگ نہ ملا دیں اور یہ بھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کے نہایت احتیاط اور صحت کے ساتھ لکھا جانے کا کیسا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس ہدایت کا ماحصل یہی ہے۔ کہ قرآن شریف لکھا جاتا تھا اور سارے کا سارا لکھا گیا۔ اگر قرآن شریف کی ہر ایک آیت اور سورۃ لکھنے کا دستور نہ ہوتا تو اس ہدایت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور آنحضرت صلعم کی دوسری باتوں کے لکھے جانے میں اعتراض ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اور ان کے قرآن شریف سے مخلوط ہونے سے احتیاط کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی۔ بخاری کتاب العلم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات پر لکھنے والوں کی طرف سے کسی اختلاط کا اندیشہ نہ تھا وہاں بعض احادیث لکھ لینے کی اُنہیں اجازت دی گئی جس سے یہ بات اور بھی مضبوط ہوتی ہے +

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں قرآن کے لکھا جانے کی شہادت

پھر جب حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت کی سرگذشت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن شریف اُس زمانہ میں ہی لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ زمانہ جاہلیت میں بہت غضبناک اور پُرجوش طبیعت رکھتے تھے اور غالی بُت پرست تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ آنحضرت صلعم شرک اور بُت پرستی کے مذہب کی بیخ اکھاڑنے کے درپے ہیں تو اس جوش میں آ کر یہ ارادہ کیا کہ میں آنحضرتؐ کو ہی جان سے مار دونگا۔ ایکدن یہ بات دل میں ٹھان کر گھر سے ننگی تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے آنحضرتؐ کی طرف روانہ ہوئے کہ جہاں کہیں وہ ملیں گے میں اُن کو قتل کر دونگا۔ راستے میں جاتے ہوئے اُن کو یہ خبر ملی کہ اُن کی اپنی ہمشیرہ فاطمہ اور اس کا خاوند سعید بن زید مسلمان ہو گئے ہیں۔ یہ بات سُن کر وہ اور بھی غُصّہ میں بھڑکے اور وہیں سے سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے کہ تا پہلے ان کا کام ہی تمام کیا جائے۔ اس وقت اُن کے گھر میں ایک تیسرا آدمی بھی موجود تھا جس کا نام خباب تھا۔ اور جس کو حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ وہ مسلمان ہے۔ خبابؓ کے پاس اس وقت ایک جلد موجود تھی جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ اور وہ اس وقت حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ اور اس کے خاوند کو سورہ طٰہٰ پڑھا رہا تھا جب ان کو یہ معلوم ہُوا کہ حضرت عمرؓ آ رہے ہیں تو فوراً خبابؓ تو ایک گوشہ میں جا چھپے اور فاطمہ ہمشیرہ حضرت عمرؓ نے وہ جلد اُٹھا کر اپنے پاس چھپا لی لیکن اُن کا چھپنا بالکل بے سُود تھا کیونکہ حضرت عمرؓ ان کے نزدیک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہوئے تھے کہ انہوں نے خبابؓ کا پڑھانا اور اُن کا پڑھنا سُن لیا تھا۔ پس جب آپ کمرہ کے اندر داخل ہوئے تو اندر قدم رکھنے کے ساتھ ہی پہلا سوال یہ کیا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے کچھ نہیں سُنا ہوگا حضرت عمرؓ نے جواب دیا نہیں میں نے سُنا ہے اور مجھے یہ بھی

اِطلاع ملی ہے کہ تم نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دین قبول کرلیا ہے۔ یہ بات کہتے ہی انہوں نے اپنے بہنوئی کو پکڑ لیا کہ اُس کا کام تمام کریں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی اُن کی ہمشیرہ اپنے خاوند کو چھڑانے کے لیئے لپٹ گئی۔ اِس ہنگامہ میں فاطمہ کو سخت زخم لگا۔ حضرت سعید اور فاطمہ دونوں میاں بیوی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے جو چاہو ہم سے سلوک کرو۔ جب حضرت عمرؓ نے اپنی ہمشیرہ کا خون بہتے دیکھا تو اپنی اس حرکت پر بہت پشیمان ہوئے۔ اور انہیں کہا۔ کہ جو کتاب تم پڑھ رہے تھے وہ لاؤ اور مجھے بھی دکھاؤ۔ کہ میں بھی دیکھوں تو سہی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کیا لاکر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ خود لکھے پڑھے تھے۔ جب انہوں نے باصرار طلب کیا تو اُن کی ہمشیرہ ڈریں کہ مبادا کہیں لے کر وہ اِس کتاب کو ضائع ہی نہ کردیں۔ اسلیئے حضرت عمرؓ سے عہد لیلیا اور انہوں نے اپنے بُتوں کی قسم کھائی کہ میں یہ کتاب ضائع نہیں کرونگا۔ بلکہ دیکھ کر واپس کردونگا۔ پھر اس نے کہا کہ تم مُشرک نجس ہو اسلیئے اس کو چھونے کے لیئے طہارت کی ضرورت ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے غسل کیا۔ اور پھر اُن کی ہمشیرہ نے وہ جلد اُن کے ہاتھ میں دیدی جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس میں سے کچھ حصّہ پڑھا اور بہت تعجب کیا کہ یہ ایسی عجیب کتاب ہے اور بہت ہی عزت کی۔ پھر خبابؓ نے اُن کا میلان دیکھ کر کہا کہ آپ اسلام قبول کرلیں۔ یہ ایک لمبی واردات ہے ہم اس کو اسی جگہ تک لکھ کر چھوڑتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں ہی مسلمانوں میں عام طور پر لکھے ہوئے قرآن شریف مستعمل تھے +

ہر ایک وحی قرآنی کا لکھا جانا

البتہ بعض وقت نادان لوگ بے سمجھی سے یہ اعتراض کردیا کرتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ بعض سورتیں اس وقت لکھی گئی تھیں لیکن یہ نہیں کہ سارا قرآن لکھا ہوا تھا یعنی جس قدر نازل ہوتا جاتا ہو۔ یہ اعتراض لغو ہے۔ اوّل تو یہ بیان کہ سورہ طٰہٰ اس وقت یعنی حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے سے پہلے لکھی ہوئی موجود تھی اسلئے نہیں کیا گیا کہ سورہ طٰہٰ کی کسی خاص فضیلت کا اظہار مقصود تھا۔ تاکہ کوئی شخص خیال کرسکے کہ راوی نے اس واقعہ کو سورۃ مذکور کی خاص فضیلت کے ظاہر کرنے کی نیت سے بیان کیا تھا۔ قصہ تو ایک اور غرض کیلئے بیان کیا گیا تھا اور یہ ذکر اتفاقی طور پر درمیان میں آگیا۔ اسلئے اِس سے یہ بات بہت واضح طور سے عیاں ہوتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا ابتدائی زمانہ میں کیا عمل تھا۔ قرآن شریف کے ابتدائی زمانہ سے ہی لکھے جانے کے متعلق یہ واقعہ ہی ایک ایسا ثبوت ہے کہ اگر اس کے سوا کوئی اور شہادت نہ بھی موجود ہو اور یہی ایک شہادت موجود ہو تو اس سے ہی یہ بات کافی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ جتنی سورتیں اس وقت تک نازل ہوچکی تھیں وہ سب لکھی ہوئی موجود تھیں اور اُن کے لکھنے کی رسم اُن میں جاری تھی۔ یہ بات کسی طرح مانی نہیں جاسکتی کہ صرف سورہ طٰہٰ ہی لکھی گئی تھی اور باقی کوئی سورۃ اس وقت تک نہ لکھی گئی تھی اسے کیا ترجیح تھی کہ جس کی وجہ سے یہ تو لکھی جاتی اور دوسری سورتوں کو نہ لکھا جاتا۔ بلکہ یہ تو ایک ایسی سُورۃ ہے جو نمازوں میں بعض اور سورتوں کی طرح عام طور پر نہیں پڑھی جاتی تھی۔ اور اس کے سوا کئی ایسی سورتیں ہیں جن میں کئی تو اس سے لمبی اور کئی اس سے چھوٹی ہیں جن کو عام طور پر نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اسلئے یہ بات سمجھنی بہت آسان ہے کہ جب ایسی سُورۃ کا لکھے ہوئے موجود ہونا ثابت ہے تو دوسری سورتوں کا ضبط تحریر میں اسی وقت سے محفوظ

ہونا بطرز اولٰے ماننا پڑتا ہے۔ایسا ہی حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ کا اُنکو یہ کہنا کہ نجس ہونے کی حالت میں کوئی شخص قرآن شریف کو ہاتھ نہیں لگا سکتا یہ بھی اس بات پر شہادت ہے کہ لکھے ہوئے نسخے قرآن کریم کے اس کثرت سے استعمال میں تھے کہ ایک نئے مسلمان شدہ شخص کو بھی یہ پتہ تھا کہ نجاست کیحالت میں قرآن شریف کو مس کرنا منع ہے۔ان تمام باتوں سے بہت صاف ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ قرآن شریف کی ساری سورتیں اُسی زمانہ میں لکھی ہوئی مسلمانوں میں استعمال ہوتی تھیں جس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد ابھی بہت کم تھی۔ اور وہ مکہ میں تھے۔اسی طرح اس حدیث سے کہ نھینا ان نسافر بالقرآن الی ارض العدو جو صحیح بخاری میں ہے ثابت ہوتا ہے۔کہ قرآن کریم لکھا جاتا تھا۔ اور اس کے دشمن کی سرزمین میں لیجانے کی ممانعت تھی کہ تا دشمن کتاب اللہ کو ضائع نہ کریں یا اُس کی بیحُرمتی نہ کریں +

حضرت ابوبکر کے جمع قرآن میں تحریر کی تلاش

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن شریف کو جمع کیا تو اُس وقت کے واقعات بھی جو پیش آئے اور جو کتب میں صحیح اور مستند طور سے درج ہیں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی لکھی جا چکی تھی۔ اس وقت سورہ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق یہ واقعہ پیش آیا کہ باوجود حضرت زید کو یہ علم ہونے کے کہ وہ آیات قرآن شریف کی ہیں اُن کو نہ لیا گیا جب تک وہ لکھی ہوئی نہ ملیں۔چنانچہ حضرت زید خود یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں موجود ہیں۔فتتبعت القران اجمعه... حتّٰی وجدت اٰخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجده مع احد غیره لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حتّٰی خاتمة براءة۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں نے قرآن شریف کو تلاش کر کے جمع کرنا شروع کیا یہانتک کہ سُورہ توبہ کا آخری حصہ مجھے ابوخزیمہ انصاری کے پاس سے ملا جو اور کسی کے پاس نہ تھا اور وہ یہ ہے لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم۔خاتمہ سورہ براءة تک"۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کو یہ علم تھا کہ یہ آئتیں سُورہ توبہ کے آخر میں ہیں اور پھر ان کو تلاش کرتے تھے جس سے سوائے اسکے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ تلاش تحریر کی تھی (دیکھو صحیح بُخاری باب جمع القرآن) جس حدیث کا یہ ایک حصہ ہے اس کی تشریح مصنف فتح الباری نے ان الفاظ میں لکھی ہے۔فلم یامر ابوبکر الا بکتابة ما کان مکتوبًا ولذالک توقف زید عن کتابة الاٰیة من اٰخر سورة براءة حتّٰی وجدها مکتوبة مع انه کان یستحضرها هو ومن ذکر معه اور پھر لکھتا ہے وکان القرآن مکتوبًا فی الصحف ولکن کانت مفرقة فجمعها ابوبکر فی مکان واحد۔ترجمہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سوائے اس کے جو لکھا ہوا موجود تھا کسی اور شئے کے لکھنے کا حکم نہ دیتے تھے یعنی انہوں نے قرآن شریف جمع کرانے میں اتنی بڑی احتیاط فرمائی کہ جس طرح اور جو کچھ آنحضرت صلعم کی حیات میں لکھا جا چکا تھا وہی لکھنے دیا۔اسی وجہ سے زید کو جو سورہ توبہ کے آخری حصہ کی آیات کو جانتا تھا کہ یہ بھی قرآن ہی کا حصہ ہیں ان کے درج کر لینے میں بہت تامل رہا جب تک

کہ اُسے وہ لکھی ہوئی نہ ملی تھیں" اور سارا قرآن قلمی لکھا ہوا تھا۔ مگر یہ قلمی لکھے ہوئے حصے متفرق لوگوں کے پاس تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کوشش کر کے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا"۔

طرزِ تحریر وہی تھی جو آنحضرتؐ کے سامنے تھی

ایک اور روایت ابن ابی داؤد سے یوں آئی ہے۔ قال قام عمر فقال من کان تلقی من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شیئا من القرآن فلیأت بہ وکانوا یکتبون ذٰلک فی الصحف والالواح والعسب قال وکان لا یقبل من احد شیئا حتی یشھد شاھدان۔ ترجمہ۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن شریف کو جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا تو حضرت عمرؓ نے عام طور پر اعلان کر دیا کہ جس کسی کے پاس قرآن شریف کا کوئی حصہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہوا ہے وہ لے آوے۔ اُن دنوں میں لوگ قرآن شریف کو کاغذ اور الواح اور کھجور کی ٹہنیوں پر لکھا کرتے تھے۔ کسی شخص سے کوئی حرف بھی لکھا ہوا منظور نہ کیا جاتا تھا جب تک کہ دو گواہوں کی گواہی نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خالی تحریر بھی کافی نہ تھی جب تک دو گواہ یہ گواہی نہ دیں کہ وہ تحریر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے روبرو لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ فتح الباری میں بھی لکھا ہے۔ وکان غرضھما ان لا یکتب الا من عین ما کتب بین یدی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا من مجرد الحفظ یعنی اس قدر احتیاط سے غرض اُن کی یہی تھی کہ سوائے اس کے کچھ نہ لکھا جائے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے لکھا گیا تھا اور مجرد حافظہ سے کچھ نہ لکھا جائے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے قبض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والقرآن فی العسب والقضم یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے جب قرآن شریف صرف کھجور کے پتوں اور کھالوں پر لکھا ہوا تھا۔ ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اور ہر ایک سورۃ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے ماتحت آپ کی زندگی میں اور آپ کے سامنے لکھی گئی تھی۔

صحابہ میں لکھنے والوں کی کثرت

یہ ایسی متفقہ اور مضبوط شہادت ہے کہ اس کے برخلاف ایک بھی حدیث ایسی نہیں ملتی کہ جس میں یہ ذکر ہو کہ فلاں سورۃ یا فلاں حصہ قرآن شریف کا لکھا نہ گیا تھا۔ جیسا کہ ان دشمنانِ حق و راستی کی علے العموم عادت ہوتی ہے۔ اسی طرح مصنف تاویل القرآن نے بھی نہایت ظالمانہ عناد اور فسادِ نیت سے راستی اور تحقیق سے آنکھ بند کر کے قرآن شریف کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں لکھے جانے کی ثابت شدہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی عبث کوشش کی ہے۔ اور قرآن شریف کے لکھے جانے کی اس طرح بے اعتباری کرنا چاہتا ہے کہ گویا اصحابؓ میں ایسے آدمی بہت موجود نہ تھے جو لکھنا جانتے ہوں چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "صحابہؓ میں لکھے پڑھے النادر کالمعدوم تھے" اور پھر لکھتا ہے۔ کہ "جب ہم زید بن ثابت کی قابلیتِ تحریر کی کیفیت معلوم کرتے ہیں تو یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے زید مدینہ میں آکر مسلمان ہوئے اور بالکل صاحبزادہ تھے قلم پکڑنا بھی نہ جانتے تھے حضرت کی جو کچھ کتابت کا کام تھا وہ یہود کرتے تھے پس بتاؤ کہ چودہ پندرہ برس اس سے پہلے وحی قرآن کس نے لکھی"۔ پھر عبد اللہ ابن ابی سرح کا ذکر کر کے کہ وہ مرتد ہو گیا تھا۔ یہ دشمنِ حق محض کذب اور افترا کے طور پر لکھتا ہے۔ کہ "جب مومنوں میں

اہل قلم کا یہ توڑا ہوا اور ایسی ایسی ناکامیاں ہوئیں تو مصلحت اسی میں دیکھی گئی کہ قرآن لکھا ہی نہ جاوے ایمانداروں کے سینہ میں محفوظ رہے اور ایسا ہی ہوا"۔ اس تحریر کا یہ مطلب ہے کہ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں کوئی لکھا پڑھا نہ تھا۔ صرف زید کچھ پڑھا ہوا ہوگا لیکن وہ کم عمر بچہ تھا اور فن تحریر سے ایسا ناواقف تھا کہ اُسے قلم پکڑنا بھی نہ آتا تھا۔ اور دوسرا شخص عبداللہ بن ابی سرح کچھ لکھا پڑھا تھا مگر وہ مُرتد ہی ہوگیا۔ چونکہ ان کے سوا کوئی شخص ایسا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود نہ تھا جو قرآن لکھ سکتا اسلئے اس کا لکھنا ہی موقوف کردیا گیا۔ یہ ایسی جاہلانہ اور نامعقول بات ہے۔ کہ ہر ایک انسان جو اسلامی تاریخ سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے خوب سمجھ سکتا ہے کہ اس شخص نے کیسی بیحیائی سے کام لیا ہے۔ ہم نے چند ایسے بزرگ صحابیوںؓ کے گرامی نام بطور نمونہ لکھ دیئے ہیں جو پڑھنے اور لکھنے میں مہارت کامل رکھتے تھے صحابہؓ میں اس کثرت سے پڑھے لکھے حضرات موجود تھے کہ کاتبان وحی میں بعض لوگوں نے بیالیس صحابیوںؓ کے نام لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر مسلمانوں میں انہیں ایام میں قرآن شریف کے مختلف حصص مختلف لوگوں میں لکھے ہوئے موجود تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا ایک ہی واقعہ اس کے ثبوت کے لئے کافی گواہ انصافاً سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں صرف ایک قرآن شریف کے لکھنے میں بیالیس لکھے پڑھوں کی تعداد کام میں لگائی گئی ہو تو کیا قیاس ہوسکتا ہے کہ اُس جماعت میں لکھے پڑھے لوگ موجود نہ تھے یا شاذونادر تھے۔ قرآن کریم کا لکھنا درکنار رہا تو جو کلمات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلے۔ یا جس طرح آپ عمل کر کے دکھاتے وہ باتیں بھی لکھ لیجاتیں چنانچہ بخاری کتاب العلم میں اس کا ذکر موجود ہے اور عبداللہ بن عمروؓ و دیگر اصحاب کے نام اس ضمن میں قابل ذکر ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی احادیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ پھر اس کے ماسوا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بادشاہوں اور دوسری قوموں کی طرف مراسلات لکھ کر ارسال کئے جاتے تھے۔ اس کے ماسوا حدیبیہ میں جب صلحنامہ لکھا گیا تھا تو وہ بھی مسلمانوں نے ہی لکھا تھا۔ چنانچہ اس کے کاتب حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ اس کے علاوہ یہودی اقوام سے عبرانی زبان میں خط وکتابت بکثرت ہوتی رہتی تھی چنانچہ اس کا ذکر احادیث میں بروایت ابوداؤد باب روایت حدیث اہل الکتاب میں آیا ہے۔ جو کتاب العلم کا ایک باب ہے۔ اور کتابتہ العلم کا باب الگ ہے جس کی حدیثوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ بہت صحابی لکھنا جانتے تھے مرد تو درکنار رہا عورتیں بھی پڑھی لکھی تھیں چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات میں بھی پڑھی لکھی عورتیں تھیں۔ اکثر صحیح احادیث سے پایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما پڑھی لکھی تھیں +

زید کا عبرانی رسم الخط سیکھنا

وہ حدیث جس کو مصنف تاویل القرآن نے نقل کیا ہے اور جس پر اپنے دعوے کی بنا رکھی ہے کہ زید صرف ایک بچہ ہی تھا اور اتنا بھی نہ جانتا تھا کہ قلم کس طرح پکڑا جاتا ہے یہ ہے قال زید بن ثابت امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتعلمت لہ کتاب یہود وقال انی واللہ ما امن یہود علی کتابی فتعلمتہ فلم یمرنی الا نصف شہر حتی حذقتہ فکنت اکتب لہ اذا کتب واقرأ لہ اذا کتب الیہ۔

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ "زید بن ثابت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا پس میں نے آپ کے لیئے یہودیوں کی کتابت کو سیکھا۔ اور آپ نے فرمایا۔ کہ قسم بخدا مجھے اپنے خطوط لکھوانے میں یہودیوں پر اعتبار نہیں پس میں نے اس کو سیکھا اور نصف ماہ کے عرصہ ہی میں اس میں خوب ماہر ہو گیا پس جب کبھی کوئی مراسلہ آپ نے لکھنا ہوتا تو میں ہی لکھتا اور جب کوئی مراسلت کہیں سے آتی میں ہی پڑھ کر سناتا" یہاں زید نے بیان تو یہ کیا ہے کہ اُس نے کس طرح عبرانی رسم تحریر سیکھی۔ اور اس کو سرولیم میور نے بھی اپنی لائف آف محمدؐ کے دیباچہ کے صفحہ ۴ کے حاشیہ میں تسلیم کیا ہے لیکن مصنف تاویل القرآن نے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اس کے یہ معنے بنانے چاہے ہیں کہ گویا یہ زید کا اپنا اقبال ہے کہ وہ عربی لکھنا نہیں جانتا تھا اور یہودیوں سے عربی لکھنی سیکھی تھی کیسی عیاری سے عمدًا اس نے کتاب یہود کے اصل معنے بدل کر من گھڑت معنے کیئے ہیں یعنی اصل معنے اس کے تو تھے "عبرانی لکھنا سیکھا" ۔ انہیں تبدیل کر کے میں نے اُن کی خاطر یہودیوں سے لکھنا سیکھا" بنا دیئے ۔ جو شخص عربی زبان میں تھوڑی سی بھی مہارت رکھتا ہو وہ خوب جانتا ہے کہ "کتاب یہود" کے معنے کسی حالت اور کسی طریق میں "یہودیوں سے لکھنا سیکھنے" کے نہیں ہو سکتے۔ اس کے معنے تو صاف طور پر یہی ہیں کہ "یہودی یعنی عبرانی رسم خط سیکھا" علاوہ بریں خود متن روایت سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زید اس میں قرآن شریف کے لکھنے کا ذکر کر رہا ہے۔ کیونکہ قرآن شریف کے لکھنے کے کام پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہودیوں کو متعین نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ کثیر حصہ قرآن شریف کا مکہ معظمہ میں نازل ہوا۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ وہاں کوئی یہودی نہ تھا۔ اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ ہجرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے مکہ معظمہ میں جتنا قرآن شریف نازل ہو چکا تھا وہ سب کا سب متفرق طور پر لکھا ہوا لوگوں کے پاس موجود اور ان کے استعمال میں تھا۔ اور زید تو مدینہ کے باشندہ تھے اور ہجرت کے بعد وہ مسلمان ہوئے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون شخص تھے جنہوں نے مکہ معظمہ میں قرآن شریف کو لکھا؟ وہاں یہود تو موجود نہ تھے پس یہود کے سپرد یہ کام کیونکر ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود پر جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بے اعتباری ظاہر فرمائی وہ قرآن کریم کے لکھنے کے متعلق نہ تھی اور نہ ہی حدیث میں کتابت وحی کا ذکر ہے۔ بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ ما امن یہود علے کتابی۔ یعنی میں اپنی خط و کتابت میں یہود کا اعتبار نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں سے عبرانی میں بعض خطوط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھوانے پڑتے تھے اور انہی کا ذکر اس حدیث میں ہے اور کتابت وحی یعنی قرآن کریم کے لکھنے کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ پھر اس روایت میں صریح طور سے یہ بھی لکھا ہے فکنت اکتب الیہ اذا کتب واقرأ له اذا کتب الیه جس سے سارا عقدہ اسبات کا کھلجاتا ہے کہ اس بیان سے غرض کیا تھی۔ اول تو یہاں عبرانی لکھنے کا ذکر ہے اور قرآن کریم زبان عربی میں تھا پھر اس عبارت سے یہ بات عیاں ہے کہ یہ مراسلات کے متعلق تھی یعنی اگر کوئی مراسلت عبرانی میں لکھنی پڑتی یا جب کوئی مراسلت عبرانی زبان میں کہیں سے آتی تو اس کے لکھنے اور سمجھنے کے لیئے یہودیوں پر اعتبار نہ کر کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے زید کو عبرانی زبان سیکھنے کا

حکم دیا۔ اور اس نے اس کی تعمیل کی۔ لفظ تو صرف اس قدر ہیں کہ جب آپ لکھنا چاہتے تو میں آپ کی طرف سے لکھتا اور جب آپ کی طرف کچھ لکھا جاتا تو میں پڑھ کر سُناتا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذکر خط و کتابت کا ہے۔ اور وحی یا قرآن کریم کے لکھنے کا اس حدیث میں اشارہ بھی نہیں۔ ایسا ہی جس باب کے نیچے یہ حدیث بیان کی گئی ہے اس سے بھی ظاہر ہے کہ اسے کتابت وحی سے کچھ تعلق نہیں +

اب رہا یہ امر کہ زید نے اِتنے تھوڑے سے یعنی پندرہ دن کے عرصہ میں کیونکر عبرانی زبان کا لکھنا سیکھ لیا سو سمجھنا چاہیئے کہ عبرانی اور عربی ایسی ملتی جُلتی زبانیں ہیں کہ ایک کے آتے ہوئے دوسری کا سیکھنا نہایت آسان کام ہے۔ عبرانی صرف عربی کی ایک بگڑی ہوئی صُورت ہے۔ پس جس صُورت میں ایک شخص عربی زبان کی رسم الخط سے پُورا واقف ہے اس کے لئے عبرانی کا رسم الخط سیکھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ عربی اصل اور عبرانی اس سے مشتق زبان ہے۔ پس جو شخص عربی زبان میں مہارت کامل رکھتا ہو اس کے لئے عبرانی کا سیکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے اتنے قلیل عرصہ میں زید کا عبرانی زبان میں مہارت حاصل کر لینا اس بات پر بھی دلیل ہے۔ کہ وہ عربی زبان کے لکھنے پڑھنے میں کامل مہارت اور ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہت ذہن رسا اور بڑی قوت حافظہ رکھتے تھے +

قرآن شریف کن چیزوں پر لکھا گیا

مُصنّف تاویل القرآن نے قرآن شریف کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں لکھے جانے کے برخلاف صرف یہی ایک حدیث پیش کی ہے۔ اسی سے ناظرین خوب سمجھ سکتے ہیں کہ عیسائی مشنریوں کے قرآن شریف کی حفاظت پر حملے اور اعتراض کیسے لغو اور بودے ہیں۔ اس شخص نے یہیں تک بس نہیں کی بلکہ اپنی عقلمندی کا اور بھی بڑھ کر ثبوت دیا ہے اور لکھا ہے کہ قرآن شریف کے لکھنے کے لئے جو چیزیں استعمال میں لائی جاتی تھیں وہ ایسی تھیں کہ دیر تک محفُوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ یہ چیزیں کیا تھیں؟ کاغذ الواح سنگ چمڑا کھجور کی تختیاں اور ہڈیاں تھیں جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ کاغذ چمڑے اور الواح سنگین پر لکھنا تو دیر تک محفُوظ رہ سکتا ہے لیکن دوسری اشیاء پر محفوظ نہیں رہ سکتا لیکن وہ لکھتا ہے کہ ان تین چیزوں پر قرآن شاذ و نادر ہی لکھا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ چیزیں بہت کمیاب تھیں۔ اور اس لئے قرآن کا کثیر حصّہ صرف ہڈیوں اور کھجور کی تختیوں پر لکھا گیا جو محفُوظ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اور اسی وجہ سے اکثر حصّہ قرآن شریف کا محو اور گم ہوگیا۔ "دروغگو را حافظہ نہ باشد" ایک مشہور ضرب المثل ہے اور اس جگہ مُصنّف تاویل القرآن کی حالت پر خوب صادق آتی ہے بحث تو یہ اُٹھائی تھی کہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں لکھا ہی نہ گیا تھا۔ اب اس مقام پر وہ کہتا ہے کہ قرآن شریف کا اکثر حصّہ ایسی اشیاء پر لکھا گیا جو دیرپا نہ تھیں اور اسلیئے وہ گم اور محو ہوگیا یعنی اس امر کو اب مان لیا کہ قرآن شریف لکھا ضرور گیا تھا۔ مگر ایسی چیزوں پر لکھا گیا تھا جو دیرپا نہ تھیں یعنی اکثر حصّہ ہڈیوں پر لکھا گیا تھا اور اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ چمڑا۔ کاغذ اور پتھر کی تختیاں بہت کمیاب تھیں۔ یہ بات بھی محض اس نے اپنے دماغ سے تراشی ہے اور کوئی روایت بیان نہیں کرتا جس سے اُسے یہ پتہ لگا ہو کہ درحقیقت قرآن شریف ہڈیوں پر لکھا گیا تھا۔ کیونکہ کاغذ اور چمڑا

اور پتھر کی تختیاں مُلکِ عرب میں ملتی نہ تھیں۔ اوّل تو ہڈیاں اور لکڑی کی تختیاں تحریر کے مطلب کے لیئے چمڑے یا کاغذ سے ناقص تھیں۔ بلکہ کاغذ کی نسبت زیادہ دیرپا ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف کی لمبی لمبی سورتوں کے لکھنے کے لیئے یہ چیزیں پورا کام بھی نہ دے سکتی تھیں اور کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً کاغذ اور چمڑے پر ہی قرآن شریف لکھا جاتا تھا۔ اور قیاس بھی اسی بات کو چاہتا ہے۔ کاغذ اور چمڑا اکثرت عرب میں ملتے تھے دوسری چیزیں محض ایسی حالت میں استعمال کی جاتی ہونگی جب مثلاً سفر میں ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے کاغذ یا چمڑا نہ مل سکے۔ اسکے مُؤیّد وہ روایت ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ وہاں جب حضرت عمرؓ اپنی ہمشیرہ کے گھر پہنچے تو اس وقت حضرت فاطمہؓ ہمشیرۂ حضرت عمرؓ سورہ طٰہٰ پڑھ رہی تھیں حضرت عمرؓ کو دیکھتے ہی انہوں نے اسکو اپنے کپڑوں میں فوراً چھپالیا۔ اگر اتنی لمبی سورۃ کسی ہڈی یا لکڑی پر لکھی ہوتی تو اِس طرح کپڑوں میں چھپانا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس قدر لمبی سورۃ ایک ہی ہڈی یا لکڑی پر تو لکھی نہ جاسکتی تھی بلکہ اس کے لیئے بہت سی ہڈیاں اور لکڑیاں بکار ہونگی جن کا یکایک اپنے پاس ہی چھپا کر رکھ لینا ممکن نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر حصہ قرآن شریف کا کاغذوں پر یا چمڑے پر جو کاغذ کی طرح بنا یا جاتا ہے لکھا جاتا تھا۔ ہاں بوقت ضرورت دوسری چیزوں پر بھی لکھ لیا جاتا تھا۔ پس تمام شہادت مذکورہ بالا سے یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ کامل و مکمل قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپکے سامنے اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھا جا چکا تھا۔ اس کے بعد ہم وہ دلائل بیان کرینگے جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ سارا قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حفظ بھی کرلیا تھا +

(۳) وہ دلائل جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہی صحابہ رضی اللہ عنہم حفظ کر چکے تھے

قرآن کریم کا حفظ کرنا

ہم یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کی حفاظت کے مُتعلّق بہت احتیاط کو کام فرمایا کرتے تھے اور آپ کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی تو فوراً اُسی وقت اپنے کسی کاتب الوحی کو طلب فرما کر وہ آیت شریفہ اس سے لکھوا لیتے۔ اسی طرح سارے قرآن شریف کی ایک ایک آیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے لکھی گئی۔ علاوہ ازیں روایات معتبرہ متواترہ صحیحہ سے ثابت ہے۔ کہ آپ کا یہ معمول تھا کہ جب کبھی کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی تو اسی وقت مجلس میں سب حاضرین کو خواہ وہ دشمن ہوتے یا دوست ضرور سُنا دیا کرتے تھے۔ اور آپ کی مُقدس جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تو وہ تھے جو بہ سبب اکثر آپ کی مجلس میں حاضر ہونے کے تازہ وحی الٰہی کو اسی وقت آپکے دہن مبارک سے سُن کر حفظ کر لیتے۔ اور جو حاضر نہ ہوتے وہ دوسروں سے سُنکر حفظ کر لیتے یا لکھوا کر اپنے پاس رکھ کر بتدریج حفظ کر لیتے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم صرف

چند اخلاقی باتوں اور نیک نصائح یا تمدنی اور فوجداری قوانین کا مجموعہ ہی نہ تھا جس کے مطالب کو یاد رکھنا کافی سمجھا جاتا بلکہ قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اور ان کے بعد آج تک اہل اسلام کا یہ ایمان رہا ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہؤا ہے اور اس پاک کتاب کا ایک ایک لفظ خدا کے مُنہ سے نکلا ہؤا ہے۔ اور انکے اس محبوب و مقصود کا کلام ہے جس کو انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بدولت پالیا تھا۔ اور ہر حرف میں بیشمار برکات بھری ہیں۔ ان کا ایمان تھا۔ کہ اس کا ہر لفظ ایک بیش بہا آسمانی خزانہ ہے جو اس دنیا میں اللہ تعالےٰ نے ان کو عطا کیا ہے۔ اسلئے اس کو نہایت محفوظ ترین مقام یعنی قلب میں محفوظ رکھنے کی طرف اس قدر متوجہ رہتے۔ وہ ایسے جوانمرد بندگان خدا تھے (خدا کی بے اندازہ برکتیں اور رحمتیں اُن پر ہمیشہ نازل ہوتی رہیں) کہ ہر نوع کی تنگی اور تکلیف کا مقابلہ کیا۔ اپنے اہل و اقارب سے جدا ہوئے۔ یار و مددگار سے مہجور ہوئے۔ گھر بار چھوڑے جان و مال قربان کئے۔ غرض جو کچھ تھا سب کچھ اسی پر قربان کر دیا۔ پر اسکی حفاظت کے مقصد کو ادھورا نہ چھوڑا ان کے کانوں میں جب کوئی نئی آیت پڑتی تو اس سے ان کی جانوں میں ایک نئی رُوح نفخ ہوتی۔ اور نئی ہمت اور نیا استقلال شامل حال ہوتا۔ قرآنی آیات اُن کی پاک رُوحوں کی غذا تھیں۔ اور ہر نئی آیت ایک نئی لذت بخشتی اسلئے وہ ہمیشہ اسی جد وجہد میں لگے رہتے کہ اپنی روحوں کو اس غذا سے سیر رکھیں۔ چنانچہ اسی لئے وہ ہر آیت کو بڑی احتیاط کے ساتھ یاد کر لیتے تھے۔ وہ آیات کے نزول کا اس طرح انتظار کرتے رہتے تھے جس طرح سخت پیاسا آدمی پانی کا انتظار کرتا ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بکثرت اسی لئے رہتے تھے کہ جب کوئی تازہ آیت نازل ہو تو اسکو فوراً سُن لیں اور حفظ کرنے میں سبقت کریں۔ ان کی حالتوں کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ حضور رسالت مآب صلعم میں رہنے کے کس قدر مشتاق تھے چنانچہ اکثر کا تو یہ حال تھا کہ کسی قدر کاروبار تجارت وغیرہ بطور حصُول معاش کر کے باقی تمام وقت اس محبوب حقیقی فخر موجودات صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد پروانہ وار گزارتے۔ جو اپنے مشاغل ضروریہ کی وجہ سے غیر حاضر رہتے تھے۔ ان میں سے بعض نے ایکدوسرے سے ملکر یہ انتظام کیا ہؤا تھا کہ باری باری ایک اپنا کام کرتا رہے اور دوسرا حضور میں حاضر رہے اور اگر کوئی آیت نازل ہو تو اس کو محفوظ کر کے اپنے غیر حاضر بھائی کو پہنچائے۔ اور پھر وہ اپنے کام پر چلا جائے اور دوسرا حضور میں موجود رہے۔ اس طریق سے گویا وہ تمام وقت ہی حاضر بحضور رہتے تھے۔ اور جب کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی تو فوراً اسکو محفوظ کر لیتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے مضافات میں ایسے مقام میں رہتے تھے جہاں ایک انصاری ان کے ہمسایہ تھے جس کے ساتھ انہوں نے یہ انتظام کیا ہؤا تھا کہ دونوں نوبت بہ نوبت آنحضرت سرور کائنات صلعم کے دربار میں حاضر رہیں۔ اور جو کچھ سُنیں یا دیکھیں اس سے ایکدوسرے کو مطلع کرتے رہیں یعنی ایک روز ایک اپنے معاش کیلئے کام کرتا اور دوسرا دربار نبوت میں حاضر رہتا اور دوسرے روز وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا اور اوّل الذکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ "جب میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں رہتا تو اس دن کی وحی وغیرہ کی تمام خبریں اس دوسرے شخص کو لا سُناتا

اور جس دن وہ حاضر دربار رسالتؐ ہوتا تو وہ اخبار مجھے لا سُناتا۔" (صحیح بخاری) اس کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے جنہوں نے ہجرت کے بعد مخالفوں کے دکھ پہنچانے اور اذیت دینے کی وجہ سے تنگ اور مجبور ہو کر اپنے معاش کے کاروبار ہی چھوڑ دیئے تھے۔ ایسے بزرگ اپنا سارا وقت مسجد نبوی ہی میں گذارتے اور ہر وقت اسبات پر آمادہ رہتے کہ جب کوئی آیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو اسی وقت یاد کر لیں۔ ان کا شغل تلاوت قرآن ہی تھا۔

آنحضرت صلعم کا صحابہؓ کو حفظ و تعلیم قرآن کی رغبت دلانا

یہ طرز حفاظت قرآن شریف کی اُس آلہی وعدے کے ماتحت عمل میں آرہی تھی جو خُدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں کیا تھا۔ نری خوش اعتقادی سے ایسی احتیاط پیدا نہیں ہو سکتی۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے اور یاد کرنے کیلئے بہت سخت تاکید فرماتے رہتے۔ جیسا کہ مسلم کی حدیث ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔ عن عقبۃ بن عامر قال خرج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ونحن فی الصفۃ فقال ایکم یحب ان یغدو کل یوم الی بطحان او العقیق فیاتی بناقتین کوماوین فی غیر اثم ولا قطع رحم قلنا یا رسول اللہ کلنا نحب ذلک قال افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرا ایتین من کتاب اللہ خیر لہ من ناقتین وثلث خیر لہ من ثلث واربع خیر لہ من اربع ومن اعدادھن من الابل (رواہ مسلم) یعنی عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ ایک روز حضرت رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ اور ہم اس وقت صفہ میں تھے۔ آپ نے پوچھا کہ تم میں سے کون اسبات کی خواہش رکھتا ہے کہ ہر روز بطحان یا عقیق کو جائے۔ اور بڑی کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی کو گزند پُہنچائے گناہ کیئے اور قطع رحم کیئے کے لائے۔ ہمنے عرض کیا۔ یا رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہم سب اس بات سے محبّت رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی صبح کو مسجد میں آکر کتاب اللہ (قرآن کریم) کی دو آیتیں پڑھاتا یا پڑھتا نہیں۔ جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بڑھ کر ہیں اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں جتنی آیتیں پڑھے پڑھائیگا وہ اتنے ہی اُونٹوں سے بہتر ہونگی۔ ایسا ہی بخاری میں یہ حدیث آئی ہے عن عثمان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تم سب سے بہتر وہی ہے جو قرآن شریف کو سیکھتا اور سکھاتا ہے۔ ایسا ہی بخاری اور مسلم دونوں میں یہ حدیث صحیح موجود ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ہے۔ عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الماھر بالقرآن مع السفرۃ الکرام البررۃ۔ والذی یقرا القرآن یتتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران۔ یعنی قرآن کے ماہر اُن فرشتوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو بہت عزت والے اور بزرگ ہیں اور جو شخص قرآن شریف کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے۔ اور نہایت مشکل سے اسکے حروف کو ادا کرتا ہے تو اس کے لئے دو چند اجر ہے۔ ایک اور حدیث ہے عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا حسد الا علی اثنین رجل اٰتاہ اللہ القرآن فھو یقوم بہ اناء اللیل واناء النھار

رجل اٰتاہ اللہ مالاً فھو ینفق منہ اٰناء اللیل واٰناء النھار۔ یعنی ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ رشک دو آدمیوں کے ساتھ کرنا جائز ہے ایک تو اس شخص کے ساتھ کہ جسے اللہ نے قرآن پڑھایا ہوا ور وہ دن رات اُس کی تلاوت میں مشغول ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ دوسرے اس آدمی کے ساتھ جسے خدا نے مال دیا ہوا ور وہ رات دن اُسے خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔ پھر ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے۔ عن ابی موسی الاشعری عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال المؤمن الذی یقرأ القراٰن کالا ترجۃ طعمھا طیب وریحھا طیب والمؤمن الذی لا یقرأ القراٰن کالتمرۃ طعمھا طیب ولا ریح لھا۔ یعنی ابو موسیٰ اشعریؓ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ مومن جو قرآن پڑھتا ہے اسکی مثال نارنجی کی طرح ہوتی ہے کہ اس کا ذائقہ بھی خوشگوار اور خوشبو بھی طیب ہوتی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اسکی حالت کھجور سے مشابہ ہوتی ہے جس کا ذائقہ تو اچھا ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ اب اس آخری حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دو گروہوں میں تمیز کردی ہے یعنی ایک تو وہ گروہ علیحدہ بیان کیا ہے جو صرف قرآن شریف پر عمل ہی کرتا ہے اور اسکی تلاوت میں غفلت کرتا ہے ایسے گروہ کو بے خوشبو کہا ہے اور دوسرا وہ گروہ اس پہلے گروہ سے ممتاز کیا ہے جو عمل بھی کرتا ہے اور تلاوت بھی کرتا رہتا ہے اس گروہ کو خوشبو دار ثمر سے مشابہت دی ہے اور اسکی ترجیح بیان فرمائی ہے۔ اس سے اور نیز دوسری حدیثوں سے نہایت صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن شریف پر عمل کرنے کی تاکید ہی نہ فرماتے تھے بلکہ تلاوت قرآن شریف کی بھی اسی قدر تاکید فرماتے تھے آنحضرت صلعم کی تعلیم میں حفظ قرآن کو جس احتیاط اور التزام کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے قرآن پر عمل کرنے کے پہلو کو کہیں جُدا نہیں کیا گیا۔ اصل علت غائی حفاظت اور تلاوت کی یہی ہے کہ اس کو عملی زندگی میں ہمیشہ زندہ رکھا جاوے۔ اور جذب برکات ونفعات اور کشف واخذ انوار ربانی اور تزکیۂ نفس اور حصول معرفت وقرب الٰہی کے لئے بار بار پڑھکر اس پر تدبر اور تفکر کیا جائے +

احادیث میں حفظ قرآن کی تاکید

ہم نے اِس جگہ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق پر عمل کیا ہے۔ ورنہ جس قدر تاکیدی احکام قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں اور جتنی اہمیت اس امر کو دیگئی ہے ان صحیح اور مستند روایات کا کتب احادیث میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ ان کا یہاں نقل کرنا بباعث طوالت ناظرین کی ملالت کا باعث ہوگا حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں استذکار اور تعاہد قرآن پر ایک علیحدہ باب باندھا ہے۔ اس باب میں بہت سی احادیث اِس مضمون کی ہیں کہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن پر مداومت کی تاکید فرمائی ہے ایسا ہی ایک اور باب بعنوان "تعلیم الصبیان القراٰن" قایم کیا ہے جس میں قرآن کریم کے اولاد کو تعلیم کرنے کے احکام ہیں۔ اور ایک تیسرا باب بعنوان "خیرکم من تعلم القراٰن وعلمہ" قائم کیا ہے۔ یعنی بہترین انسان وہ ہے جو قرآن شریف پڑھتا اور پڑھاتا ہے۔ اور ایک چوتھا باب "القراءۃ عن ظھر القلب" یعنی قرآن شریف کو زبانی یاد کرنے کے احکام اور مراتب کے متعلق باندھا ہے مسلمانوں میں تنقید و تحقیق وصحت روایات کے لحاظ سے بخاری صحیح کو اصح الکتب

بعد کتاب اللہ مانا گیا ہے اور اس کتاب میں ہم اس قدر احادیث پاتے ہیں کہ ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے اس لئے بنظر اختصار اس جگہ صرف ابواب کے نام لکھ دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان تمام احادیث کا مفصلاً ذکر نہیں کرتے ابواب کے نام ہی اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن حفظ کرنے کی مومن کو تاکید اکید فرماتے رہتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو یاد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور بہت بڑے ثواب اور اجر کا ذریعہ جانتے تھے۔ انہی احکام کی تعمیل میں پہلے زمانوں کے مسلمان اگر سارا نہیں تو بعض بعض حصص قرآن شریف کے ضرور یاد کر لیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہر ایک اسلامی ملک میں ہزارہا حافظ قرآن شریف کے اور قاری موجود ہیں جو سارا قرآن شریف کمال صحت کے ساتھ حافظہ میں یاد رکھتے ہیں۔ جن کی مثال دُنیا کی کسی غیر اسلامی قوم میں موجود نہیں لیکن عرب کے خاص حالات ایسے تھے کہ ان کے لیے قرآن شریف کو ازبر کرنا بہت ہی آسان تھا۔ چنانچہ ولیم میور جیسا معاند اور مخالف اسلام بھی اپنی کتاب لائف آف محمدؐ کے دیباچہ کے صفحہ ۱۶ پر اسی خصوصیت کو تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے "عرب لوگ نظم کے بہت سرگرم اور دلدادہ مشتاق تھے لیکن ان کے پاس ایسے اسباب موجود نہ تھے کہ جن سے وہ اپنے شاعروں کے کلام کو ضبط تحریر میں لا سکتے۔ اسلئے بہت مدت تک ان میں یہی رواج رہا کہ اپنے شعرا کے کلام اور اپنی قوم اور آبا و اجداد کے تاریخی واقعات کو دل کی زمین الواح پر ہی بہت عمدگی اور صحت کے ساتھ طبع کر لیتے۔ اس طرز سے ان میں قوت حافظہ کمال درجہ ترقی پر پہنچ گئی ہوئی تھی۔ اور یہی قوت حافظہ اس نئی پیدا شدہ رُوح کے ساتھ پورے اخلاص اور شوق سے قرآن (کریم) کے حفظ کرنے میں کام آئی"۔

عہدۂ امامت حاصل کرنے میں تحریص حفظ قرآن

ہم نے چند احادیث جو اُوپر لکھی ہیں ان سے یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت صلعم یہ بھی چاہتے تھے کہ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم علم قرآن میں ایک دوسرے پر فوقیت اور سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چند ایسے اسباب موجود تھے کہ جن کی وجہ سے قرآن شریف کے حفظ کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے صحابہؓ کوشش کرتے رہتے تھے۔ ازانجملہ ایک یہ بات تھی کہ نمازوں میں امامت کرانے کیلئے وہ شخص ہی معزز عہدہ امامت کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ جو دوسروں سے علم قرآن میں بڑھا ہوا ہو چنانچہ اس عزت کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ کر قرآن شریف کو یاد کرنے میں محنت کرتا۔ تمام صحیح احادیث اسی بات کو ثابت کرتی ہیں۔ یہ امامت دراصل مسلمانوں میں ایک نہایت عزت کا مقام اور اعلیٰ مرتبہ تھا۔ خود حضور صلعم بھی امام تھے۔ اور شریعت اسلامی میں اس امامت کے معزز اور مقدس عہدہ پر مامور ہونے کا قرعہ اسی شخص کے حق میں بلالحاظ قومیت ووجاہت وعمر پڑتا جو علم قرآن میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہوتا چنانچہ ایک روایت میں ہے۔ عن عمرو بن سلمۃ قال کنا بماء ممر الناس وکان یمر بنا الرکبان ... اذا اتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکانوا اذا رجعوا مروا بنا فاخبرونا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کذا وکذا وکنت غلاما حافظا فحفظت من ذالک قرانا کثیرا فانطلق ابی وافدا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی نفر من قومہ فعلمہم

الصلوٰۃ وقال لیؤمکما اقرؤکم فکنت اقرؤھم لما کنت احفظ فقدموني فکنت اؤمھم۔ یعنی عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ ہم (یعنی ہماری قوم) ایک دفعہ کسی مقام پر ڈیرہ افگن ہوئی جو پانی کے قریب تھا۔ اور جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاتے وہ اسی راہ سے جاتے تھے جو ہمارے پاس سے گذرتا تھا جب وہ واپس آتے تو ہمیں تمام وحی جو حضور صلعم سے تازہ سن کر آتے سنا جاتے تھے۔ میں ابھی بچہ ہی سا تھا (قریب آٹھ سال کے عمر تھی) پر میری قوت حافظہ بہت تیز تھی جو جو میں سنتا جاتا تھا حفظ کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ اکثر حصہ قرآن شریف کا اسی طرح ان لوگوں سے ہی میں نے یاد کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد میرا باپ اپنی قوم کے بہت سارے عمائد کو ساتھ لے کر اسلام قبول کرنے کے لیے حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں آنحضرت صلعم نے انہیں داخل اسلام فرمایا اور انکو نماز کی تلقین فرمائی۔ اور حکم دیا کہ تم میں نماز میں امامت وہ شخص کرایا کرے جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو۔ چونکہ میں نے قرآن کا بہت حصہ پہلے ہی حفظ کیا ہوا تھا اسلئے امامت کا حق میرا ہی تھا۔ پس مجھے ہی اسلئے امام منتخب کیا۔ اور میں ہی نمازوں میں ان کا امام ہوتا رہا۔" یہ حدیث ابوداؤد میں درج ہے اور بخاری اور دوسرے محدثین نے بھی اس کو لکھا ہے۔ ایسا ہی جب کبھی کوئی نئی قوم اسلام میں داخل ہوتی تو ان میں امامت کے فرائض ادا کرنے اور مسائل اسلام کی تلقین و تعلیم دینے کے لیے وہی شخص بھیجنے کے لئے منتخب کیا جاتا تھا جو علم قرآن میں فائق اور سابق ہوتا تھا +

کثرت تلاوت قرآن میں آنحضرت صلعم کا نمونہ

اس سے یہی نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن شریف جاننے والوں کی صرف اسی قدر عزت کیجاتی تھی۔ بلکہ یہ تو ان کی اکرام و اعزاز کا صرف ایک ہی شعبہ بیان ہوا ہے۔ ان لوگوں کی ہر پہلو سے عزت اور توقیر و تعظیم کی جاتی تھی۔ منجملہ اور وجوہ کے یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جس سے صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے قرآن شریف کو اپنے مقدس دلوں کی الواح پر نہایت احتیاط کے ساتھ منقوش کیا ہوا تھا۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خلوت و جلوت میں قرآن شریف کی اکثر تلاوت فرماتے رہتے اور اپنا نمونہ پیش کرتے رہتے تھے۔ ناظرین یہ خیال نہ کریں کہ آنحضور صلعم صرف نمازوں ہی میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے سامنے ایسے کئی واقعات موجود ہیں کہ سفر کو جاتے ہوئے اونٹ پر سواری کی حالت میں کئی سورتیں پڑھ جایا کرتے تھے چنانچہ بخاری میں یہ روایت ہے۔ رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم فتح مکۃ وھو یقرأ علی راحلتہ سورۃ الفتح۔ یعنی میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے روز دیکھا کہ آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے۔ تو آپ نے سورۃ الفتح پڑھی۔ آنحضور صلعم کو دوسروں سے قرآن سننے سے بھی بڑی محبت تھی۔ اور یہ محبت آپ میں ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بھی صحابہؓ کا قرآن کریم پڑھنا سنا کرتے تھے چنانچہ بخاری باب نسیان القرآن میں اس قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ رات کو جب ایک شخص نماز میں قرآن پڑھ رہا تھا تو آپ سن رہے تھے۔ اسی طرح بخاری میں یہ روایت بھی درج ہے۔ عن عبداللہ قال قال لی النبی صلے اللہ علیہ وسلم اقرأ علیّ قلت یا رسول اللہ آقرأ علیک وعلیک انزل قال نعم فقرأت سورۃ النساء حتّٰی

اتیت علی ھذہ الآیۃ فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید و جئنا بک علی ھؤلاء شہیدا
قال حسبک الآن فالتفت الیہ فاذا عیناہ تذرفان۔ یعنی عبد اللہ سے روایت ہے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایکدفعہ مجھے فرمایا کہ کچھ قرآن سناؤ۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ حضور آکیا میں آپ کو سناؤں اور آپ پر تو نازل ہوا ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ ہاں (اور دوسری روایت میں ہے کہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ دوسرے کو پڑھتا سنوں) یہ بات سن کر میں نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی یہانتک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا۔ فکیف اذا جئنا الآیہ۔ تو آپ نے فرمایا اس وقت بس کرو۔ جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو چل رہے تھے +

صحابہ کا یقین قرآن کریم کی حفاظت پر

یہ چند واقعات جو محض بطور نمونہ درج کیئے گئے ہیں بتلا رہے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنا نمونہ دکھا کر صحابہؓ کو قرآن پڑھنے کی رغبت دلایا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں کا آج کل کے نام کے مسلمانوں جیسا حال نہ تھا۔ وہ تو اپنی زندگیوں کی علت غائی یہی سمجھتے تھے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکموں اور آپ کے نمونوں پر عمل کرتے رہیں۔ اسی میں ان کی خوشی ہوتی تھی۔ اسلیئے آپ کی ایسی ترغیبات کبھی بے اثر نہیں جاتی تھیں۔ وہ پاک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین قرآن شریف کے ایک ایک لفظ کو بڑی امانت اور احتیاط کے ساتھ اپنے دلوں کے خزانوں میں جمع کر لیتے اور اسکی تلاوت اور تعلیم پر مداومت فرض اولی سمجھتے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت اور تعلیم و تعلم کا رواج ایسا عالمگیر طور پر مسلمانوں میں ہو گیا تھا۔ کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشگوئی فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ علم قرآن جہان سے اُٹھ جائیگا تو صحابہؓ کو اس بات سے بہت تعجب پیدا ہوا۔ اور زیاد ابن لبید صحابی اسی تعجب و حیرت میں فوراً بے ساختہ بول اُٹھا کہ یا رسول اللہ علم قرآن دنیا سے کیسے مفقود ہو سکتا ہے جبکہ ہم سب خود اسے پڑھتے رہتے ہیں! اور اپنی اولاد کو اسکی تعلیم دیتے ہیں اور ہماری اولاد اپنی آیندہ نسلوں کو قیامت کے دن تک قرآن سکھلاتی اور پڑھاتی رہیگی۔
قرآن شریف کی حفاظت کے انتظام کی سمجھ تو صحابیوں کے ایسے کلام سے بخوبی آسکتی ہے۔ اس سے اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم قرآن شریف کی حفاظت کے زبردست انتظام میں ایسی سرگرمی اور کوشش دکھاتے تھے کہ اُن کے خیال میں یہ بات سما سکتی ہی نہ تھی کہ اس حالت کے بعد قرآن پر کوئی زمانہ ایسا آسکتا ہے کہ وہ دنیا سے اُٹھ جائیگا۔ ان لوگوں میں قرآن شریف کی محبت ایسی بھری ہوئی تھی کہ مارے محبت کے انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بات کو بھی اُس وقت نہ سمجھا اور جھٹ عرض خدمت کرنا شروع کر دیا۔ دراصل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ نہ تھا کہ دنیا سے قرآن کریم کے الفاظ مفقود ہو جائیں گے بلکہ آپ کے ان الفاظ سے مراد یہ تھی کہ ایک زمانہ ایسا آنیوالا ہے۔ کہ جس میں لوگ قرآن شریف پر عمل کرنا چھوڑ دینگے۔ اس حدیث کو ترمذی اور بعض دیگر محدثین نے بیان کیا ہے۔ اور ہم اسکو نقل بھی کر چکے ہیں! اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی ایک ایک آیت صحابہؓ میں ایسی عام طور پر شائع ہو چکی اور سب کو یاد

تھی کہ یہ بات اُن کے دماغوں میں آہی نہ سکتی تھی کہ کسی وقت کُل تو کیا اُس کا کوئی حصہ بلکہ کوئی جملہ۔ لفظ حرف یا نقطہ ہی گم ہو سکے گا۔ اور یہ بات بھی ان کی سچی تھی اور علاوہ ازیں ان کو قرآن اور آنحضرت صلعم نے سکھلایا بھی یہی تھا کہ یہ کبھی گم نہیں ہوگا اور ہمیشہ محفوظ رہیگا۔ پھر وہ اس بات کو کیونکر مان سکتے تھے کہ کوئی زمانہ اس کے گم ہونے کا بھی آسکتا ہے۔ پھر جب انہیں اصل مطلب حضور سرور کائنات کے کلام کا سمجھ آگیا تو پھر خاموش ہو گئے اور اُن کی تسلی ہو گئی کہ آپ کے کلام سے قرآن شریف کی حفاظت کے اعتقاد میں کوئی نقصان نہیں بلکہ لوگوں کا اس پر عمل میں کمزور ہو جانا مراد ہے +

ختم قرآن کی میعاد سے حفظِ قرآن کی شہادت

یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن شریف کو حفظ کرنا اور اس کی تلاوت میں لگے رہنا اپنی بڑی بھاری خوشی سمجھتے تھے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قرآن کریم کی تلاوت پر مواظبت کے حکموں کی نہایت جوش اور باقاعدگی سے تعمیل کرتے تھے۔ تلاوت میں کثرت کا انہیں اتنا شوق تھا کہ بعض صحابی ہر رات قرآن شریف ختم کر لیا کرتے تھے اور یہ حالت دیکھ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو انہیں ایسا طریق اختیار کرنے کی ہدایت دینی پڑی کہ جو ان پر بار گراں نہ ہو۔ چنانچہ بخاری میں ایک باب اس مضمون پر ہے کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہیئے۔ اس باب میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے کہ ایک صحابی کی نسبت آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا کہ وہ ہر رات قرآن شریف کا ختم کرتا ہے۔ اس پر آپ نے اُسے بلا کر ہدایت کی کہ قرآن پڑھنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ آہستگی سے تلاوت کرنی چاہیئے۔ ایک رات میں نہیں بلکہ سات دنوں میں یا پانچ دنوں میں یا کم از کم تین دنوں میں ختم کرنا چاہیئے اِس سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہؓ میں ایسے بزرگ بھی موجود تھے جنھیں قرآن شریف کے حفظ پر اتنی دسترس تھی کہ وہ ایک رات میں ہی سارا ختم کر لیا کرتے تھے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس حکم دینے سے کہ کم از کم تین دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہیئے منشاء یہ تھی کہ قرآن کو طوطے کی طرح بلا مطلب سمجھے نہیں پڑھتے رہنا چاہیئے بلکہ اس کو غور وخوض اور تدبر و تفکر سے پڑھنا چاہیئے۔ ایک اور حدیث جو مسند دارمی میں ہے یوں ہے۔ عن عبداللہ بن عمرو قال یارسول اللہ فی کم اختم القرآن قال اختمہ فی شہر قلت انی اطیق قال اختمہ فی خمسة وعشرین قلت انی اطیق قال اختمہ فی عشرین قلت انی اطیق قال اختمہ فی خمس عشرۃ قلت انی اطیق قال اختمہ فی عشر قلت انی اطیق قال اختمہ فی خمس قلت انی اطیق قال لا یعنی عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ اس نے حضور صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کتنے عرصہ میں قرآن ختم کیا کروں فرمایا ایک ماہ میں۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے جلدی ختم کر سکتا ہوں فرمایا پچیس دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا۔ کہ میں تو اس سے بھی جلدی ہی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا بیس دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ہی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا پندرہ دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا۔ کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا دس دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں فرمایا پانچ دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ہی ختم کر سکتا ہوں تو پھر آپ نے فرمایا بس

یعنی اب اس سے کم میعاد نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۵۳ پر یہ حدیث منقول ہے عن ابن مسعود اقرؤ القرآن فی سبع ولا تقرؤہ فی اقل من ثلث۔ یعنی قرآن کریم کو سات دنوں میں پڑھا (ختم کیا) کرو۔ اور تین دنوں سے کم مدت میں ہرگز ختم نہ کرو۔ ایسا ہی اسی کتاب میں ایک اور حدیث منقول ہے جو یہ ہے عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یختم القرآن فی اقل من ثلث۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو تین دنوں سے کم عرصہ میں ختم نہیں کیا کرتے تھے +

صحابہ میں حافظانِ قرآن کی کثرت

اب ان روایات واحادیث معتبرہ سے یہ بات عیاں ہو رہی ہے کہ اصحابِ رسول کریم صلعم نے قرآن کریم کے پڑھنے میں ایسا کمال حاصل کیا ہوا تھا کہ صرف ایک ہی رات کے اندر سارا قرآن شریف الحمد سے لیکر والناس تک ختم کر لیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلعم کو پڑھنے کی میعاد مقرر کرنی پڑی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کے متعلق بار بار پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ اس سلسلۂ دلائل سے یہ بات بدیہی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ صحابہؓ کو قرآن شریف عموماً حفظ ہوتا تھا۔ کیونکہ ایسی جلدی پڑھنا حفظ ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے دیکھ کر پڑھنے سے محال ہے۔ اور جب ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ رات ہی رات میں وہ لوگ قرآن شریف ختم کرتے تھے تو اس سے اور بھی اس بات پر وضاحت سے ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ کہ ان کو حفظ یاد تھا۔ ورنہ اگر قرآن شریف ان کو یاد نہ ہوتا تو رات ہی رات میں اس کا پڑھ لینا کیسے ممکن ہو سکتا تھا +

اس کے علاوہ یہ بات اس طرح بھی ثابت ہوتی ہے کہ اکثر معتبر اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی کثیر جماعت کو قرآن کریم حفظ تھا۔ چنانچہ قرا کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ قرا کا اصل مفہوم یہ ہے کہ قرآن شریف اوروں کو سکھانے کے لیئے حفظ کرنے والے لوگ" چنانچہ صاحب فتح الباری نے لفظ قرا کے بھی معنے کئے ہیں "قرا کے معنے یہ ہیں الذین اشتہروا بحفظ القرآن والتصدی لتعلیمہ۔" وہ لوگ جو قرآن شریف کو حفظ کرنے اور دوسروں کو قرآن شریف سکھلانے کیلئے مشہور تھے"۔ اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کے ذیل میں آنیوالوں کے لیئے ضروری ہے کہ انہیں کامل طور پر علم قرآن بھی ہو۔ احادیث سے ثابت ہے کہ ستر قرا کو کفار نے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بئر معونہ کے قریب قتل کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظانِ قرآن کی صحابہؓ میں کیسی کثرت تھی"۔ باب القراء من اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" کی ذیل میں حضرت امام بخاریؒ نے بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ از انجملہ ایک یہ ہے۔ ذکر عبداللہ بن عمرو عبداللہ بن مسعود فقال لا ازال احبہ سمعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقول خذوا القرآن من اربعۃ من عبداللہ بن مسعود وسالم ومعاذ وابی بن کعب۔ یعنی عبداللہ بن عمرؓ نے عبداللہ بن مسعود کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ہمیشہ اس سے محبت کرتا رہونگا۔ کیونکہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے سنا ہے کہ چار آدمیوں عبداللہ بن مسعود سالم ومعاذ وابی ابن کعب سے قرآن سیکھو۔ اس حدیث سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کا علم اور قرآن کی تعلیم دینا انہیں چار بزرگوں میں محدود تھا اور دوسرے صحابہؓ میں یہ قابلیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اس حدیث کے الفاظ میں یہ بات

موجود ہے کہ گویا ان چاروں کے سوائے کوئی دوسرا صحابی قرآن کو یاد نہ رکھتا تھا۔ اور اسکو پڑھا نہ سکتا تھا۔ یہ بات ثابت ہے کہ تمام صحابہ قرآن شریف کا کچھ نہ کچھ حصہ جانتے تھے اور یہ امر بھی عیاں ہے کہ ان میں کثیر التعداد ایسے لوگ تھے جو قرآن شریف کے حافظ تھے یعنی جن کو قرآن شریف ازبر یاد تھا لیکن قرآن شریف کا معلم بننے کیلئے ضروری ہے کہ اس شخص میں فہم قرآن بھی اعلےٰ درجہ کا ہو اور علم قرآن بھی بہت بڑھ کر ہو۔ اس حدیث میں ان لوگوں کی معلمیّت کی حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کی اس قابلیّت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ اچھی طرح قرآن سکھانے کی قابلیّت رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تمام سورتوں کو اچھی طرح سکھا سکتے تھے اسلیئے خود پورے قرآن شریف کے حافظ تھے۔ اور ایک یہ وجہ بھی ہے کہ صحابہؓ کی جماعت بہت کثیر تھی۔ اسلیئے ہر ایک آدمی کو یہ موقعہ میسّر نہیں آسکتا تھا کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی سے آیات قرآنی سُن سکتا۔ اکثروں نے اگر کچھ حصہ آنحضرت صلعم سے سُنا بھی ہوگا تو کثیر حصہ بالواسطہ سیکھا۔ پس شاید ان چار کا نام اس واسطے لیا کہ انہوں نے اکثر حصہ قرآن شریف کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے بلا واسطہ سُنا اور سیکھا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک عبد اللہ بن مسعود اس سے اگلی حدیث میں کہتے ہیں کہ میں نے ستّر سے زیادہ سورتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ حاصل کیں +

حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت علم قرآن میں

غرض اسی قسم کی کوئی خصوصیتیں ہونگی جن کی وجہ سے آنحضرت صلعم نے ان چاروں کا نام اس حدیث میں لیا ہے۔ ورنہ احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ صحابہؓ میں بکثرت ایسے لوگ موجود تھے۔ جن کو نہ صرف قرآن شریف ازبر یاد ہی تھا بلکہ اُن کو فہم قرآن بھی اعلےٰ درجہ کا عطا کیا گیا تھا۔ ان لوگوں میں سے بطور مثال ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی کا نام نامی پیش کرتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ صاحب کمالات ظاہری و باطنی یار غار رسول کریم صلعم تھے اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کا سب سے فائق ہونا کئی موقعوں پر بیان فرمایا۔ مثلاً آپکے آخری ایّام کے ہی چند واقعات لے لو۔ آخری ایّام کے واقعات ہم اسلئے لیتے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ شاید بعد میں دوسرے صحابہؓ نے فوقیت حاصل کر لی ہو۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب سُورۃ النصر نازل ہوئی تو ذکر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ رو پڑے جب بعض لوگوں نے تعجب کیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر تم سے بہتر قرآن سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس سُورۃ میں یہ اشارہ تھا کہ اب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس دُنیا سے کُوچ کر جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور اسی لیئے حضرت ابوبکرؓ رو بھی پڑے تھے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مسجد میں جس قدر دریچے ہیں وہ سب بند کر دیئے جائیں سوائے حضرت ابوبکرؓ کے دریچے کے۔ اس میں بھی یہ اشارہ تھا کہ جو دسترس آپ کو علم قرآن میں حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آخری بیماری کے دنوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انہی کو امام مقرر فرمایا۔ اب یہ بات صحیح اور معتبر احادیث سے ثابت ہے کہ نمازوں کے لیئے امام وہی شخص منتخب ہونا چاہیئے جو سب سے بڑھ کر علم قرآن میں فوقیت رکھتا ہو جبکہ امامت کے لیئے قرآن شریف کے علم میں برتری ایک شرط ہوئی اور آپنے ہمیں بتلائی تو جس شخص کو آپنے امامت کے لیئے منتخب کیا ضرور ہے

کہ اس کو علم قرآن میں تمام جماعت صحابہؓ پر ہر طرح کی فوقیت آپ کے نزدیک مسلم ہو۔ یہاں تو ابوبکرؓ کو سب صحابہؓ میں سے بڑھ کر قرآن جاننے والا مانا گیا لیکن وہاں اس حدیث میں جہاں چاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا گرامی اسم نہ بیان کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جن ناموں کا ذکر ہے وہ حصر کے طور پر نہیں بلکہ کسی خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق قرآن شریف کے حافظ بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بھی بنا رکھی تھی جس میں وہ ہر روز بلاناغہ بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ بلکہ کفار نے ان کو ایک دفعہ اس سے روکا بھی تھا اور یہ کہا تھا کہ اس طرح قرآن سُنا سُنا کر تم ہماری عورتوں اور بچوں کو مسلمان کر لوگے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضور سرور کائنات صلعم کے حضور میں ہر وقت کی حاضر باشی کا شرف ان کو سب سے بڑھ کر نصیب ہؤا۔ ان امور سے صاف طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ قرآن شریف کے حافظ بھی تھے۔ اور فہم و علم قرآن میں تمام صحابہؓ سے بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کو منصب امامت اور جادہ خلافت پر ممتاز نہ فرماتے +

حافظان قرآن کے نام

اسی طرح عبداللہ بن عمرو نے ایک حدیث بیان کی ہے جو نسائی میں موجود ہے اور جس کے راوی معتبر تسلیم کیے گئے ہیں اور وہ یہ ہے عن عبداللہ بن عمرو قال جمعت القران فقرأت فی کل لیلۃ فبلغ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرأہ فی شھر۔ یعنی عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ میں نے سارا قرآن اپنے حافظہ میں جمع کر لیا یعنی ازبر کر لیا اور میری عادت تھی کہ ہر رات ایک ختم قرآن کر چھوڑا کرتا تھا۔ اس امر کی اطلاع حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گئی تو آپ نے مجھے ہدایت فرمائی کہ ایسا مت کیا کرو بلکہ قرآن شریف کو ایک مہینے میں ختم کیا کرو“ غرض اسی طرح صحابہ کبار رضؓ کی جماعت میں بہت سے صحابیؓ ایسے ثابت ہوتے ہیں جن کو قرآن شریف ازبر تھا۔ اور چاروں خلیفے یعنی حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق حضرت عثمان حضرت علی اور طلحہ۔ سعد۔ ابن مسعود۔ سالم۔ رضی اللہ عنہم کے نام حافظان قرآن میں صحیح روایات میں موجود ہیں۔ مرد تو خیر قرآن شریف کے حافظ اور عالم تھے ہی صحابیہؓ میں عورتیں بھی اس کے حفظ کرنے کی عزت سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ وغیرہ کے گرامی اسماء تاریخ صحیحہ کی اس فہرست کو زینت دے رہے ہیں مہاجرین کے علاوہ انصارؓ میں بھی قرآن شریف کے لئے ایسی ہی محبت اور شوق تھا لیکن اس جگہ فہرست دینے سے طول ہوتا ہے یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں نے سمجھی سے کام لینے والے متعصب لوگ یہی نہ سمجھ لیں کہ قرآن کریم کے حافظ صرف اتنے لوگ ہی تھے جن کے نام لکھے گئے ہیں ایسا گمان واقعات سے بہت بعید ہوگا۔ کیونکہ ابھی ہم دکھلا آئے ہیں کہ صرف ایک ہی موقعہ پر کفار نے ستر قرا کو قتل کر دیا تھا جس سے کثرت قرا کا ثبوت کافی طور پر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ غزوہ یمامہ میں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے تھوڑے دن بعد واقعہ ہؤا قریباً اسی قدر قرا شہید ہوئے۔ جن میں مذکورین کے زمرہ سے حضرت سالمؓ تھے جب جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ جنگ یمامہ میں ہمارے اکثر قرا کام آگئے۔ اسلیئے اب ضروری ہے کہ قرآن شریف ایک ہی جلد میں جمع کر دیا جائے تو اس موقعہ پر انہوں نے صرف سالمؓ کا نام نہ لیا تھا بلکہ کہا تھا کہ قال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقراء القران یعنی حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ کہ حضرت عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ غزوہ یمامہ میں قرآن شریف کے قراء

بہت سے قتل ہو گئے ہیں۔ اگر صرف وہی لوگ حافظ اور قراء قرآن ہوتے جن کے نام لکھے گئے ہیں تو حضرت عمرؓ کو چاہیئے تھا کہ صرف سالمؓ ہی کا نام لیتے کیونکہ نامزدہ لوگوں سے تو صرف ایک سالمؓ ہی وہاں کام آئے تھے۔ مگر حضرت عمرؓ کے الفاظ سے یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ وہاں کثرت سے حافظ شہید ہو گئے جس سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قراء و حفاظ قرآن بکثرت تھے +

قوم خزرج کے چار جامعین قرآن

بخاری میں ایک یہ حدیث منقول ہے۔ عن انس قال مات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یجمع القرآن غیر اربعۃ ابو درداء ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت وابو زید یعنی انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور سوائے چار اشخاص ابو درداء و معاذ بن جبل و زید بن ثابت و ابو زید کے کسی نے قرآن جمع نہ کیا۔ اور ایک روایت میں جو بخاری ہی میں ہے بجائے ابو درداء کے ابی بن کعب کا نام ہے جمع کے عام معنے تو احادیث میں کتاب کی صورت میں جمع کرنیکے ہی آئے ہیں۔ پس اگر یہی معنے اس حدیث میں مراد لیئے جائیں تو اس سے قرآن شریف کے حافظوں کی تعداد کا حصر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی تعارض اُن احادیث صحیحہ سے واقع ہوتا ہے جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر چار آدمی قرآن شریف کو ایک جا جمع کر چکے تھے اور کتاب کی صورت میں کلام اُن کے پاس موجود تھا تو حضرت عمرؓ نے اتنا خوف کیوں ظاہر کیا اور حضرت زیدؓ نے اس کام کو اتنا مشکل کیوں سمجھا سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ یا حضرت ابوبکرؓ اور زید کا منشاء ان اصل مسودات کو جمع کرنا تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق آپ کے کاتبوں نے لکھے تھے۔ اسلیے ان کا مطلب اس سے حل نہ ہوتا تھا کہ کسی کا اپنے طور پر جمع کیا ہوا قرآن شریف ان کو مل جائے۔ اور یہی معنے اِس حدیث کے کرنے پڑینگے جس میں یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور قرآن کسی چیز میں جمع نہ تھا یعنی مطلب اس کا یہ ہوگا کہ وہ مسودات جو آنحضرت کی ہدایت کے مطابق لکھے گئے تھے وہ ایک جگہ جمع نہ کیئے گئے تھے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اس سے صحیح اور معتبر احادیث میں کسی قسم کا تعارض باقی نہیں رہتا۔ اور اگر لفظ جمع کے دوسرے معنے مُراد لئے جاویں یعنی کُل قرآن شریف کا حفظ کرنا تو اس صورت میں حدیث کے معنے سمجھنے کیلئے پہلے واقعات کو دیکھنا چاہیئے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ حضرت انسؓ نے اس روایت کو کس حال اور کس موقعہ اور کس غرض سے بیان کیا تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے۔ کہ یثرب میں (جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے مدینہ منورہ ہو گیا) دو قومیں خزرج اور اوس رہتی تھیں۔ ان دو قوموں میں عرب جاہلیت کے زمانہ کیطرح باہمی سخت عداوت اور بُغض تھا۔ پھر جب یہ دونوں قومیں مسلمان ہو گئیں تو ان میں سے دشمنی تو دور ہو گئی اور سب ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے لیکن ترقیات دینی میں رشک ضرور رہا۔ حضرت انسؓ قوم خزرج میں سے تھے۔ ایک موقعہ پر قوم اوس کے بعض افراد نے اپنے چار آدمیوں کی نسبت بڑے فخر سے ذکر کیا۔ اور اُن کی شہرت اور عظمت پر بڑا ناز ظاہر کیا۔ اس فخریہ بات کا جواب دوسری رقیب قوم کی طرف سے بھی ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت انسؓ نے اپنی قوم کے چار آدمیوں کے نام لیکر ان کی ایک بہت بڑی خدمت اسلام اور بڑا نمایاں کام بیان کیا یعنی قوم خزرج میں سے یہ چار ایسے بزرگ ہوئے ہیں کہ جنہوں نے قرآن شریف کو جمع کیا جس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ان کو قرآن شریف ازبر تھا اور یا یہ کہ انہوں نے

متفرق مسودوں سے خود قرآن شریف کو نقل کرلیا ہوا تھا غرض بہرحال حضرت انسؓ کا یہ بیان تو صرف ایک رقیب قوم کے مقابل میں بطور جواب تھا جب اس بات پر غور کی جاتی ہے کہ یہ چاروں بزرگ جن کا نام حضرت انسؓ نے اپنی روایت میں لیاہے ان کی ہی قوم میں سے تھے تو اس بات کے ثبوت پر زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عبداللہ بن مسعودؓ اور سالمؓ اور کئی دوسرے مشہور انصار و مہاجرین کے ناموں کو چھوڑ کر انہی چاروں پر حصر کر لینا کہاں درست ہو سکتا تھا۔ وہ تو ایسے بزرگ تھے کہ جن کی قرآن دانی آفتاب عالمتاب کی طرح مسلّم اور روشن ہے اور حضرت انسؓ ایسے ناواقف نہ تھے کہ اگر کلیہ طور پر روایت کرتے تو مشاہیر قرآن دانوں اور جامعانِ قرآن کے اسماء کو ناواقفیت کی وجہ سے چھوڑ دیتے پس ظاہر ہے کہ یہ کلمات اُن کے اپنی قوم کی عظمت قوم اوس کے مقابلہ پر ظاہر کرنے کیلئے تھے +

حفظ قرآن میں صحابہ کیلئے سہولت

اس جماعت کے علاوہ بھی عام صحابہ کو قرآن شریف یاد تھا کیونکہ ان لوگوں کے سوا جن کو سارا قرآن یاد تھا باقی تمام صحابہؓ کو اکثر حصص قرآن شریف کے یاد تھے کسی کو کوئی حصہ کسی کو کوئی حصہ۔ اس طرح بھی قرآن شریف تمام صحابہ میں محفوظ تھا۔ تمام صحابہؓ علےٰ قدر استطاعت قرآن شریف کو کلاً یا جزءً یاد کرتے رہتے تھے اور قدرتی طور پر اس کے یاد کرنے میں قرآن شریف کے تدریجی نزول نے ان کے لیے بہت آسانی کر دی تھی۔ ایک آیت یا سورۃ کے نزول کے بعد دوسری آیت یا سورۃ کے نزول تک اتنا وقفہ ان کو ملجاتا تھا کہ بآسانی وہ پہلی آیت یا سورۃ کو یاد کرلیں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ سارا قرآن شریف تیئیس سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ نازل ہُوا تھا۔ اور اگر آج کل کے زمانہ میں مسلمانوں کے کم سن بچے ایک یا دو سال میں قرآن شریف کو بآسانی حفظ کر سکتے ہیں تو وہ عرب (صحابہؓ) جن کی عجیب و غریب قوت حافظہ تمام دُنیا میں مسلّم ہے اور جو قرآن شریف کو یاد کرنا بڑا ضروری اور اہم فرض سمجھتے تھے انہیں اپنی بڑھی ہوئی عمروں میں بہت تھوڑے عرصہ میں قرآن یاد کرلینا کچھ مشکل نہ تھا اور پھر جبکہ ان کو تیئیس سال کی مہلت اس کے یاد کرنے کے لیے دی گئی تو اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی مشکل نہیں رہتی کہ قرآن شریف کا یاد کرلینا ان لوگوں کے لیئے نہایت آسان تھا اور اسی لیے اس کثرت سے حافظ ان کے اندر موجود تھے +

نماز سے حفظ قرآن میں مدد

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن شریف کا یاد کرنا بعض اغراض کے لیئے ہر مسلمان کے لیے لازمی تھا خواہ اس کا تھوڑا حصہ یاد کرے یا بہت یا سارا ہی کرے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر نماز ایک ضروری فرض ہے اور نماز میں قرآن شریف ضروری طور پر پڑھا جاتا تھا۔ بغیر قرآن شریف کے بعض حصص پڑھنے کے نماز ہوتی ہی نہیں۔ گویا نماز پڑھنے کا حکم من وجہٍ قرآن کے کل یا جزو کے حفظ کرنے کا حکم ہے۔ جو ہر مسلمان پر مسلمان رہنے کے لیئے فرض ہے۔ اور نماز صرف ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ دن میں کم از کم پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے۔ اور ہر دفعہ کی نماز میں کئی کئی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور عموماً ہر رکعت میں علاوہ معیّنہ سورۃ قرآن یعنی فاتحہ کے کوئی نہ کوئی حصہ قرآن شریف کا ضرور پڑھنا پڑتا ہے صحابہؓ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ عموماً نماز دل کے سچے لگاؤ سے پڑھا کرتے تھے۔ اور خشوع خضوع سے اپنے اس فرض کو ادا کیا کرتے تھے اور نماز کو اپنا ہتھیار اور خدا سے قُرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کی نسبت یہ ثابت ہے کہ وہ نمازوں میں

دیر تک قیام کیا کرتے اور زیادہ لمبے عرصہ تک قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ ان پانچوں نمازوں کے علاوہ ایک اور نماز ہے جو رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے اور جس کو نماز تہجد کہتے ہیں۔ اس نماز تہجد میں خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ بڑے بڑے حصص قرآن شریف کے پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی نماز تہجد میں بہت قرآن شریف پڑھا کرتے یہاں تک کہ آپ کی نسبت بعض احادیث میں آیا ہے کہ بعض دفعہ ایک ہی رکعت میں قرآن شریف کے آٹھ نو پارے یعنی ۱/۳ حصہ قرآن شریف کے قریب آپ نے پڑھا تھا۔ اور صحابہؓ کی طرز زندگی یہی تھی کہ وہ آنحضرت صلعم کے عمل و فعل کو اپنے مسلک کے لیے نمونہ سمجھتے تھے۔ اور آپ ہی کے نمونہ پر چلتے تھے۔ اور اسلیئے وہ بھی تہجد میں قرآن شریف زیادہ زیادہ پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہؓ کے تہجد میں قرآن شریف پڑھنے کا جو ذکر آگیا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایک صحابی کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے ایک رکعت میں سورۃ البقرہ کو پڑھا اور یہ سورۃ قرآن شریف کا بارھواں حصہ یعنی اڑھائی پارے ہیں۔ تہجد کی نماز کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تو حکم تھا ہی کہ قم اللیل الا قلیلا نصفه الآیہ۔ یعنی نصف رات یا اس کے قریب قیام کیا کرو۔ اور اسی حکم الٰہی کی تعمیل میں آپ اس قدر کھڑے ہوا کرتے تھے کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاؤں بھی سُوج جاتے تھے مگر صحابہؓ کو بھی یہ حکم تھا کہ فاقرؤا ما تیسر منه اور سارے معذوریت کے اسباب گن کر کہ خدا یہ بھی جانتا ہے کہ بعض تم میں سے بیمار ہونگے اور بعض جہاد کرینگے اور بعض سفر میں ہونگے پھر بھی حکم دیا کہ قرآن شریف تہجد میں پڑھا ضرور کرو۔ ہاں بیمار مسافر مجاہد کے لئے اجازت ہے کہ بہت نہیں تو تھوڑا ہی پڑھ لے۔ قرآن شریف میں اس تاکید کو پاکر صحابہؓ کہاں غافل رہ سکتے تھے۔ کثرت سے روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا بڑا حصہ قرآن شریف کا رات کو تہجد میں پڑھا کرتے تھے بلکہ بعض تو اس قدر مبالغہ اس میں کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کو یہ ہدایت دینی پڑی کہ اتنے وقت میں کم سے قرآن شریف ختم نہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ صرف تہجد ہی کی نمازوں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ آپ جماعت کی نمازوں میں بھی بہت قرآن کریم پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے جماعت کراتے وقت پہلے سورۃ النساء پڑھی اور پھر اس کے بعد سورہ آل عمران پڑھی یہ دونوں سورتیں قرآن شریف کا آٹھواں حصہ ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ صرف ایک ہی نماز میں قرآن شریف کا اتنا بڑا حصہ پڑھا گیا تو کس قدر تکرار کا قرآن شریف کے پڑھے جانے میں ثبوت ملتا ہے۔ بہت ساری حدیثیں اس بات کی گواہ ہیں کہ صبح کی نماز کی ایک رکعت میں سُورۃ البقرہ جیسی لمبی لمبی سورتیں پڑھی جاتی تھیں۔ شام کی نمازوں کے لیے اتنا وقت نہیں مل سکتا کہ لمبی سُورتیں ان میں پڑھی جاسکیں۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سُورۃ الطور جیسی سُورتیں ان میں بھی پڑھا کرتے تھے اور یہ بھی لمبی سُورۃ ہے جس میں پچاس کے قریب آیات ہیں۔ اسی طرح جب کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی کہیں نماز میں امامت کا موقعہ ملتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نمونہ پر وہ بھی عمل کرتے اور اُن کی طرح نمازوں میں لمبی لمبی سُورتیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ کئی دفعہ اُن کی لمبی سُورتیں پڑھنے کی شکایتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے عشاء کی نماز میں سُورۃ البقرہ تمام کی مقتدیوں میں ایک شخص تھے جو دن کی

محنت سے تھکے ماندے تھے اور وہ جلد آرام کرنے کے واسطے جانا چاہتے تھے ان کو اس لمبی قرأت سے تکلیف ہوئی اور اس پر انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی ایسا ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہ لوگ اپنی تنہائی کی نمازوں میں بھی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے بلکہ ان نمازوں میں توجہ کھول کھول کر وہ لوگ قرأت لمبی پڑھتے تھے۔ اب اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ لوگ صرف قرآن شریف کو ایک دفعہ یاد ہی نہ کر لیا کرتے تھے بلکہ جتنا قرآن ان کو یاد ہوتا تھا اس پر نمازوں میں اور نمازوں سے باہر اس کثرت سے تکرار کی مواظبت اور مداومت کرتے رہتے تھے کہ وہ ہمیشہ حافظہ میں تازہ رہتا تھا۔ اگر قرآن شریف کی ایک آیت بھی لکھی نہ جاتی تو حافظوں کے الواح قلب اس کے نقش کندہ تھے کہ ایک نقطہ بھی اس کا ضائع نہ ہونے پاتا۔ قرآن شریف نمازوں میں اور نمازوں سے باہر پڑھنے کی اس قدر کثرت سے آنحضرت صلعم اور صحابہؓ کی عادت تھی کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بعض سورتیں بعض صحابہؓ نے نمازوں میں بار بار پڑھی جاتی سن کر ہی یاد کر لی تھیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر تمام دوسرے ذرائع حفاظت قرآن شریف کے معدوم بھی کر دیئے جاتے تو صرف نمازوں ہی میں اس کے پڑھے جانے کا رواج اس بات کے لیئے کافی تھا کہ اس میں کسی طرح کا تصرف نہ ہونے پائے اور یہ پورے طور پر ہر قسم کی آلائش اور حملہ سے محفوظ رہے۔ پس یہ تمام واقعات جب باہم متفق ہوتے ہیں تو قرآن شریف کے تغیر و تحریف سے محفوظ رہنے پر ایسے برجستہ دلائل پیدا ہوتے ہیں کہ جن کی مثال دنیا میں کہیں پائی نہیں جاتی۔ کونسی الہامی کتاب دنیا میں ایسی ہے جس کی حفاظت کے لیئے ایسے اسباب تو پیدا ہوئے ہوں تمام دنیا کی الہامی کتابوں میں نہ کسی کا ایسا دعوٰے ہے اور نہ ہی کسی کے پاس حفاظت کے ایسے ثبوت ہیں ۔

۴۔ آیتوں اور سورتوں کی ترتیب

ترتیب نزول اور ترتیب جمع

ہم نے پہلے دلائل قویّہ سے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی لکھا گیا اور آپ کی زندگی میں ہی قراء اور حفّاظ نے تمام و کمال حفظ کر لیا تھا لیکن یہ مسلّم بات ہے کہ اس مقدّس اور مہیمن کتاب الٰہی کا نزول تدریج کے ساتھ ہوتا رہا اور تئیس سال کے عرصہ میں پورا ہوا۔ چنانچہ بعض سورتیں تو ایسی ہیں جو ایک ہی دفعہ اکٹھی نازل ہوئیں اور بہت سی اس قسم کی ہیں کہ جن کا نزول تدریجی ہوا۔ اور بہت لمبے عرصہ میں پوری ہوئیں۔ ایسا بھی ہوتا رہا کہ ابھی ایک سورۃ مکمل نہ ہونے پاتی تھی کہ دوسری سورۃ نازل ہونی شروع ہو جاتی بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ دو مختلف سورتوں کی آیات ایک ہی وقت میں نازل ہو جاتیں۔ غرض قرآن شریف ایک جلد اور ایک وقت میں اکٹھا نازل نہیں ہوا بلکہ آیات اور سورتیں تئیس سال کے عرصہ میں تدریج کے ساتھ نازل ہوئیں۔ اور ترتیب نزولی ایسی نہ تھی کہ جس سے ہر ایک سورۃ کی آیات علی التواتر نازل ہو کر اسکو پورا کرنے کے بعد دوسری سورۃ شروع ہوتی حسب اقتضائے منشائے الٰہی مختلف سورتوں کی آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئیں۔ اور اس وقت جو قرآن شریف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اس میں ترتیب آیات ترتیب نزولی کے موافق نہیں بلکہ یہ وہ ترتیب ہے جو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنی عین حیات بلکہ عین نزُول آیات کے موقعہ پر اشارۂ وحی آلٰہی سے کی تھی۔ اس موقعہ پر ایک معترض یا ایک منقد یہ سوال کریگا کہ آیا یہ ترتیب قرآنی جو نزُولی ترتیب کے مطابق نہیں ہے کس نے کی تھی؟ کیا خود آنحضرت سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی قرآن شریف کو اس طرح ترتیب دیا تھا یا کسی اَور نے ترتیب دی تھی؟ پھر اگر قرآن شریف کی کوئی ترتیب حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی تو کیا یہ موجُودہ ترتیب قرآنی وہی ترتیب ہا اُس سے مختلف؟ یعنی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا موجُودہ قرآن شریف بلحاظ ترتیب سُور و آیات وہی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے چھوڑا تھا یا یہ قرآن اُس قرآن سے مختلف ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا تھا؟ ہر قسم کی اندرُونی اور بیرونی شہادتیں اس بات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ قرآن شریف کی سُورتوں اور آیتوں کی موجودہ ترتیب سوائے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے کا کام نہ تھا۔ بلکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بھی اپنے خیال کو اسمیں کوئی دخل نہ تھا بلکہ آپ نے یہ ترتیب قرآنی وحی آلٰہی کی ہدایت کے موافق دی تھی۔ اور موجودہ قرآن شریف بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا تھا۔ اُس سے ایک سرمو کا بھی فرق نہیں۔ اگرچہ اس امر پر اندرُونی شہادت موجود ہے۔ مگر اس مضمون میں اس شہادت کے لئے گنجائش نہیں۔ اسلیئے ہم صرف خارجی شہادت کو یہاں پیش کرینگے۔ مگر اتنی بات ہم ضرور کہینگے کہ یہ محض ایک جھوٹا خیال ہے کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب ٹھیک نہیں۔ اور اس سے بہتر ترتیب بھی ہو سکتی ہے۔ اس خیال کا ذرہ بھر بھی ثبوت کسی معترض کے ہاتھ میں نہیں۔ اور حق بات یہ ہے کہ اس ترتیب سے بہتر ترتیب قطعاً ناممکن ہے یعنی ہر ایک سورۃ قرآنی اور اسکی ہر ایک آیت ایسی منتظم۔ اور موزون طور سے مُرتّب اور برمحل رکھی ہوئی ہے کہ یہ ہو سکتا ہی نہیں کہ اس سے بہتر کوئی ترتیب ہو سکے۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ ربط وضبط کلام کے لحاظ سے ایسے اعجازی نظام سے رکھا ہوا ہے کہ ایک لفظ کا تغیر و تبدل بھی ممکن نہیں۔ وہ شخص جو اس نظام قرآنی پر کسی قسم کا حرف رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ بعض آیات ماقبل و مابعد میں مضمون کا ربط نہیں یا کوئی مضمون چھوٹا ہوا ہے وہ صرف اپنی جہالت اور حماقت سے ایسی بات منہ سے نکالنے کی جُرات کرتا ہے۔ ایسے لوگ نہ تو عربی زبان کے محاورات سے ماہر۔ نہ ربط کلام کے فن کے واقف ہوتے ہیں۔ اور نہ قرآن شریف کو ہی غور اور تدبر سے پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ ورنہ یہ تعجیل کار معترض اگر قرآن شریف ہی پر غور و خوض اور تدبر کریں تو ان پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ ان کے اعتراض سب غلط اور بیجا ہیں۔ اور قرآن شریف کی ہر ایک آیت اور سُورۃ بلکہ اس کا ہر ایک لفظ صحیح موقعہ اور محل پر منتظم ہے اور کوئی مضمون غیر منسلک اور غیر متفق نہیں۔ مگر اس موقعہ پر اندرونی شہادت کو پیش کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہم اسے اس جگہ پیش ہی کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے صرف ایک حصّہ ثبوت یعنی خارجی شہادت کو ہی پیش کیا جائیگا۔

قرآن کریم کی شہادت کہ ترتیب جمع قرآن وحی آلٰہی سے ہوئی

یہ شہادت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ قرآنی آیتوں اور سورتوں کی موجُودہ ترتیب نہ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور نہ زیدؓ نے کی تھی۔ بلکہ یہ وہی ترتیب ہے جو آنحضرت صلعم نے وحی آلٰہی کی ہدایت سے کی تھی۔ اس زبردست گواہی سے نہ صرف حدیثیں ہی بھری پڑی ہیں بلکہ خود قرآن شریف بھی اس پر شاہد ہے

چنانچہ دیکھو سورۃ القیامہ آیت ۱۹- ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ یہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ قرآن کا جمع کرنا اور اس کا تجھ کو (نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو) پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو تم اسی کے پڑھنے کی پیروی کیا کرو۔ اس آیت کریمہ سے یہ بات پورے طور سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جمع قرآن شریف مع ترتیب آیات وسور صرف اللہ تعالےٰ کی وحی سے عمل میں آئی۔ یہ آیت شریفہ صاف بتلا رہی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر جس طرح قرآنی آیات وحی کے ذریعہ سے نازل ہوئیں اسی طرح اُن کی ترتیب اور جمع بھی اللہ تعالےٰ نے بذریعہ وحی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سمجھا دی۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن شریف نہ صرف اسی بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے بلکہ یہ دعوےٰ بھی کرتا ہے کہ اس کا جمع کرنا اور اسکی ترتیب دینا سب امر الٰہی سے ہوا ہے۔ گویا یہ قرآن شریف جیسا کہ خدا کا کلام ہے۔ اسی طرح خدا ہی نے اسکو مرتب اور جمع کیا۔ واضح رہے کہ اس آیت میں لفظ جمع جو وارد ہوا ہے اس سے مراد ترتیب اور جمع دونوں ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع ممکن نہیں۔ جمع سے مراد یہی ہے کہ ترتیب دیکر جمع کیا گیا۔ اور اس لفظ کے امر علیحدہ واقع ہونے سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ قرآن شریف اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا جس ترتیب سے وہ جمع کیا گیا یعنی اصل ترتیب قرآنی ترتیب نزولی سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس آیت میں جمع اور نزول کو دو الگ الگ امر بتایا گیا ہے۔ اگر ترتیب نزولی ہی وحی الٰہی کا منشاء ہوتا تو جمع اور نزول کو الگ الگ بیان نہ کیا جاتا۔ کیونکہ پھر نزول کے ساتھ ساتھ ہی جمع کا کام بھی ہوتا جاتا اور جمع کی کوئی الگ ضرورت نہ رہتی۔ مگر آیت موصوفہ میں اللہ تعالےٰ نے جمع کو ایک الگ فعل بیان فرمایا ہے اور پڑھنے یعنی نزول کو الگ۔ پس اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی نے ترتیب جمع اور ترتیب نزول کو الگ الگ رکھا اور نزول اور جمع دونوں کو اپنے ذمہ لیا۔ پس جس طرح وحی الٰہی کا نزول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں سارا ہو چکا۔ اسی طرح اس کی جمع اور ترتیب کا کام بھی ضروری تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی تکمیل کو پہنچ جاتا اور ایسا ہی ہوا +

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات قرآن شریف کی صاف صاف اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ترتیب قرآنی وحی الٰہی سے ہوئی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔ وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذالک لنثبت بہ فوادک ورتلنٰہ ترتیلا (الفرقان آیت ۳۲) یعنی کافر کہتے ہیں کہ سارا قرآن مکمل اور مرتب ایکدفعہ کیوں نازل نہ کر دیا گیا۔ انکو کہدو کہ مصلحت الٰہی یہی ہے تا کلام الٰہی کو جزءً جزءً نازل کرنے سے ہم تمہارے دل کو تسکین دیتے رہیں۔ اور ہم نے اسکو ٹھہر ٹھہر کر اُتارا اور اسکی تالیف بھی نہایت عمدہ کی ترتیل کے معنے میں تالیف بھی شامل ہے لسان العرب میں ہے رتل القرآن احسن تالیفہ وابانہ وتمھل فیہ یعنی ترتیب کو نہایت عمدہ کیا اور اسے کھول کھولکر اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کیا۔ بلکہ سیاق وسباق عبارت خود بتا رہا ہے کہ یہاں ترتیب کا ذکر بھی اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ تھوڑا تھوڑا نازل کرنے میں بہت سے مصالح الٰہی ہیں۔ ورنہ یہی کہ کلام الٰہی کے نزول سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل کو تسکین ہوتی رہے۔ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ مرتب کیوں نہیں سو ترتیب تالیف بھی ہم ہی کر رہے ہیں اور کرینگے۔ اور آخیر پر اسی کو

مکمل اور مرتب بنا دینگے ایسا ہی آیت وصلنا لھم القول سے بھی یہ پایا جاتا ہے کہ اجزائے قرآنی کی ترتیب کا کام بموجب دعوئے قرآن کریم وحی آلہی سے ہی ہوا +

مسئلہ حل طلب

اب ہم حدیث صحیح کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا تاریخ یا حدیث صحیح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے یا نہیں کہ موجودہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اُسی ترتیب آلہی کے ساتھ جس کا ذکر آیات مذکورہ بالا میں ہے ہمارے ہاتھوں تک نہایت امانت اور دیانت کے طریق سے محفوظ پہنچا ہے۔ اس امر کے لئے سب سے پہلے یہ بات دیکھنی ضروری ہے کہ آیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن شریف اسی طرح جمع مرتب اور منتظم چھوڑا گیا یا نہیں۔ اس امر کے ثبوت میں صحیح روایات اور معتبر احادیث کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اور ہم پہلے آیتوں کی ترتیب اور پھر سورتوں کی ترتیب پر غور کرینگے اور ہر ایک امر تحقیق طلب میں امور ذیل پر بحث کرینگے (۱) کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے قرآن شریف کو کوئی ترتیب دی ہوئی تھی؟ (۲) کیا قرآن شریف جس نہج سے نازل ہوا تھا اسی طرح اسکو ترتیب دیا گیا یا ترتیب جمع ترتیب نزولی سے مختلف تھی؟ (۳) کیا موجودہ ترتیب قرآن شریف اس ترتیب سے مختلف ہے یا وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دی تھی؟

ولیم میور کا اعتراض اور اسکا جواب

یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ ہی میں مسلمان لوگ نمازیں پڑھتے تھے اور نمازوں میں بڑا حصہ صرف قرآن شریف ہی کا پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ نمازوں کے علاوہ بھی قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت اس وقت سے ہی مسلمانوں میں مروج ہے پھر جبکہ اتنی بڑی کتاب جس میں اتنے مختلف مضامین ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلعم کی حیات میں حفظ کر لی تھی اور باقاعدہ طور پر نمازوں میں پڑھتے تھے اور ایکدوسرے کو پڑھاتے اور سکھاتے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ یہ سارے کام بغیر جمع قرآن کے عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ لیکن افسوس عیسائی معترضوں کی نے سمجھی اور ناواقفی پر کہ ان میں جس کو اسلام پر اعتراض کرنے کی سوجھی اس نے اس بات کو بطور اعتراض ضرور پیش کیا ہے۔ ہر معترض نے وہی دلیلیں اس اعتراض کی تائید میں دوہرائی ہیں جو کسی اوّل المعترضین نے پیش کی تھیں۔ ان لوگوں نے تاریخ کی قطعی اور ضروری شہادت کو ہمیشہ نظر انداز کر کے اپنے اعتراض کی بنا صرف اسی امر پر رکھی ہوئی ہے کہ اُن کے زعم باطل میں قرآن شریف کی سورتوں اور آیتوں میں کوئی ربط وضبط موجود نہیں۔ ہم ذیل میں میور صاحب کی لائف آف محمدؐ کے دیباچہ سے ایک جملہ نقل کرتے ہیں۔ جس سے ناظرین پر نہ صرف یہ بات ہی عیاں ہو جائیگی کہ عیسائی معترضین کس کس قسم کے اعتراض پیش کرتے ہیں بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہو جائیگی کہ خود سر ولیم میور صاحب نے تاریخی شہادت سے کس طرح اغماض اور اعراض کیا ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بہرحال ہم یہ بات مان نہیں سکتے کہ اس زمانہ میں کامل قرآن شریف کسی معین ترتیب سے پڑھا جاتا تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ موجودہ قرآن شریف کی نسبت مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہ اُسی ترتیب کے موافق ہے جو آنحضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود کی تھی لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے

کیونکہ اگر کسی معین ترتیب کا آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) خود فیصلہ کر دیتے اور اس پر آپ عمل کرتے تو ضروری تھا کہ وہی ترتیب آئندہ محفوظ رکھی جاتی۔ مگر جو قرآن شریف ہمارے زمانہ تک محفوظ چلا آیا ہے وہ نہ مضامین اور زمانہ کے لحاظ سے اپنے مختلف حصوں میں کسی معقول اور قابل فہم ترتیب کا متبع نہیں۔ اور یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اس موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کے پڑھنے کا حکم کرتے ہوں ہمیں اس بات پر شبہ ہے کہ جتنی تعداد قرآنی سورتوں کی اس وقت موجود ہے ان کی یہ تعداد آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خود مقرر کی تھی یا نہیں بہرحال اتنا تو ضرور ہے کہ اکثر سورتوں کی اندرونی ترتیب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت سے نہیں۔" سر ولیم میور نے اس مضمون پر کچھ حاشیے لکھے ہیں۔ ان حواشی کے پڑھنے سے مصنف کے دل کا وہ اضطراب ظاہر ہو رہا ہے جو مذہبی تعصب اور تاریخ کے صحیح ثبوت کی موجودگی کے جھگڑے سے پیدا ہو رہا ہے کبھی تعصب غالب آجاتا ہے اور دوسرے معترضین کا اتباع کر کے وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہ سورتوں کی کوئی ترتیب تھی نہ آیتوں کی۔ نہ سورتیں الگ الگ تھیں نہ ان کی تعداد مقرر تھی نہ ان میں آیتوں کی تعداد کا پتہ تھا مگر پھر جب تاریخ یعنی حدیث صحیح کی طرف دیکھتا ہے تو اسے مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ تھا مثلاً جہاں اس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں قرآن شریف کی معین ترتیب کے موجود ہونے کا انکار کیا ہے وہاں ساتھ ہی اس کے میور صاحب کو یہ بات مجبوراً حاشیہ میں تسلیم کرنی پڑی ہے کہ "یہ بات لکھی ہوئی موجود ہے کہ بعض صحابہؓ سارے قرآن شریف کی معین وقت میں تلاوت کر سکتے تھے جس سے یہ بات قرار دینی پڑتی ہے کہ اس میں بعض حصص قرآنی کا باہمی تعلق اور ربط ضرور تھا۔" ایک اور حاشیہ میں اس نے یہ بات مانی ہے کہ "آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں چار یا پانچ تو ایسے صحابی موجود تھے جو کامل قرآن شریف کو نہایت صحت کے ساتھ ازبر رکھتے تھے اور اکثر ایسے موجود تھے جو قریباً سارا قرآن ازبر رکھتے تھے۔" علاوہ ازیں جہاں اس نے سورتوں کی تعداد کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خود مقرر کرنے سے انکار کیا ہے تو تردید کے خیال سے معاً ذیل کا حاشیہ لکھ دیا ہے "لیکن اس بات کو ماننے کی وجوہ ہیں کہ بڑی بڑی سورتیں اور ان کی آیات جو زیادہ تر مستعمل تھیں وہ معین ہو چکی تھیں اور اپنے اپنے ناموں اور خاص نشانوں سے معروف اور موسوم تھیں۔ اور صحیح حدیثوں سے (آنحضرت) محمد (مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم) کا خود بعض سورتوں کا موسوم اور معروف کرنا ثابت ہے مثلاً جب غزوہ حنین میں بعض لوگ بھاگ گئے تو اس وقت ان کو آنحضرت صلعم نے اصحاب بقر کر کے پکارا تھا۔" اور پھر حاشیہ میں ہی لکھتا ہے کہ "احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اکثر صحابیوں نے قرآن شریف کی بعض سورتیں حفظ کر لی ہوئی تھیں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے قرآن شریف کی ستر سورتیں سیکھی تھیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آخری مرض کے ایام میں ستر سورتیں تلاوت فرمائی تھیں جن میں سات لمبی سورتیں تھیں۔ ان حدیثوں سے کم از کم قرآنی سورتوں میں ایک حد تک معین تقسیم ضرور ثابت ہوتی ہے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کا اس سے پتہ نہیں لگ سکتا۔" اور پھر لکھتا ہے کہ "جبکہ یہ بات ثابت ہے کہ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سُورتہائے قرآنی کا استعمال کیا کرتے تھے تو اس سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ سُورتوں کی ترتیب کا کسی حد تک آپ نے ضرور فیصلہ کر دیا ہوا تھا"۔ اسی امر کے متعلق آگے چلکر ایک اور حاشیہ میں ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ "حدیث مذکورہ بالا جس میں سُورتوں کی وہ تعداد لکھی ہے جو بعض صحابہؓ کو یاد تھیں۔ اور نیز وہ تعداد جو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت میں پڑھی تھیں مذکور ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورتیں اس وقت مکمل اور مرتب صورت میں موجود تھیں" +

ولیم میور صاحب کے دیباچہ کے متن اور مذکورہ بالا حواشی کو پڑھنے سے صاف پتہ ملتا ہے کہ اُن کے دلی بُغض و تعصب نے مجبور کر کے وہ سطور لکھوادیں جن میں متن میں اُنہوں نے اِنکار ترتیب کیا ہے لیکن تاریخ کی سچی شہادت نے ان حواشی کو اسی کے ذیل میں قلمبند کرنے پر اُسے مجبور کیا جن سے متن کی تردید ہوتی ہے۔ اگرچہ حواشی کے لکھتے میں میور صاحب نے تعصب کی وجہ سے بخل سے کام لیا ہے لیکن ان کا تضاد ایسا عیاں ہے کہ ہر ایک احتیاط اور غور سے پڑھنے والا اسے آسانی سے دیکھ سکتا ہے اور مصنّف کے دل کے اضطراب کی حالت سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ متن میں تو لکھا ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں اور سورتوں میں کوئی معین ترتیب اور ربط موجود نہیں تھی اور حواشی میں تاریخی شہادت اس کے موجود ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ متن میں لکھا ہے کہ نہ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سُورتوں کے نام ہی مقرر کئے اور نہ ہی ان کی تعداد معین فرمائی۔ لیکن حاشیہ میں صاف لکھا ہے کہ اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ سورتوں کی تعیین و تقسیم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرما دی تھی اور ان کی صورتوں کو بھی آپ نے معین فرما دیا تھا۔ بعض کلمات تعصب کی وجہ سے مصنّف نے انکے ساتھ حاشیہ میں بڑھا دئیے ہیں جیسے "بعض حصص" اور "کسی حد تک" وغیرہ یہ غور کا مقام ہے کہ جبکہ حاشیہ میں صاف طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ قرآن شریف کی ستر سورتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مرتب اور منتظم موجود تھیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ سات لمبی سورتیں بھی شامل تھیں تو پھر باقی کی چوالیس سورتوں کی نسبت جو نمازوں میں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں کیونکر گمان ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت اسی حالت میں موجود نہ تھیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مصنف نے ان باقی چوالیس سورتوں میں ترتیب کے نہ ہونے کے متعلق کوئی شہادت پیش نہیں کی۔ پس اگر اور کوئی شہادت ترتیب و سور و آیات پر نہ بھی ہوتی تو ایک مخالف معترض کے اس بیان سے ہی یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہات پیدا ہوتے ہیں کہ سورتیں اور آیات منتظم اور مُرتّب صورت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھیں۔ اور پھر اسی نتیجہ کے مؤید اس مخالف مصنّف کا یہ اقبال ہے کہ بعض صحابہ ایسے بھی موجود تھے جو نہ صرف بعض حصص کو صرف حافظہ سے دوہرا سکتے تھے بلکہ کُل کے کُل قرآن شریف کو اسی طرح دوہرا سکتے تھے۔ اور اعلےٰ درجہ کی "احتیاط صحت" کے ساتھ وہ یہ کر سکتے تھے +

آیات کی ترتیب کی قطعی شہادت

یہ دعویٰ کہ ایک ایک آیت جب نازل ہوتی تھی تو اسے یونہی بلا ترتیب رہنے دیا جاتا تھا اور کوئی نہ جانتا تھا کہ کونسی آیت کس سُورۃ کی ہے اور کہاں رکھی جاویگی بدیہی طور پر ایک لغو دعویٰ ہے اور کسی تردید کا محتاج نہیں چونکہ یہ بات

ثابت ہے کہ قرآن شریف حفظ کیا جاتا تھا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کم و بیش کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کرتے جاتے تھے تو آیات کی ہی کوئی ترتیب نہ تھی تو یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ کوئی معین حصہ کوئی شخص حفظ کر لیتا کیا یہ قیاس میں آسکتا ہے کہ ہر ایک شخص بجائے خود ایک ترتیب دیکر قرآن شریف کو حفظ کرتا ہو اور اس طرح جتنے صحابی حفظ کرنے والے ہوں اسی قدر مختلف ترتیبیں آیات کی مروج ہوں؟ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ قرآن شریف لکھا بھی جاتا تھا اور بعض سورتوں کے لکھے ہوئے نسخوں کا موجود ہونا اور استعمال میں آنا بھی تاریخ صحیح سے ثابت ہے، پس ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہر ایک نسخہ ایک جداگانہ ترتیب سے لکھا جاتا تھا؟ یہ کیسا بڑا حماقت دعویٰ ہے کہ ایک ہی ترتیب سب صحابی ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ہر ایک حفظ کرنے والا ایک الگ ترتیب کا پیرو ہو اور ہر ایک نسخہ جو لکھا جاتا ہو وہ جداگانہ ترتیب سے لکھا جاتا ہو اور نہ کوئی دو پڑھنے والے اور نہ کوئی دو نسخے ایک ہی سورۃ کے باہم کسی ایک ترتیب پر متفق ہوں اور نہ ہی حافظہ اور تحریر کا باہم کسی ایک ترتیب پر اتفاق ہو۔ گویا ایک ایک سورۃ کی ہزارہا الگ الگ ترتیبیں موجود تھیں۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ جب نمازوں میں قرآن شریف پڑھا جاتا تھا تو کیا ہر ایک پڑھنے والا ایک الگ ترتیب سے کوئی حصہ پڑھ دیا کرتا تھا؟ ایسی صورت میں کوئی مقتدی یہ کب کہہ سکتا تھا کہ اس نے کونسا حصہ قرآن شریف کا پڑھا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسی عظیم کتاب جو اس طرح شب و روز عام پڑھی جاتی ہو اور گھروں کے اندر پڑھی جاتی تھی وہ ایک ایسی بے ترتیب صورت میں تھی کہ کسی فقرہ کے متعلق کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ کہاں کا فقرہ ہے۔ اور ہزارہا آدمی جو شب و روز اس کی تلاوت کرتے تھے وہ سب جس طرح کسی کا جی چاہا کوئی فقرہ آگے اور کوئی فقرہ پیچھے پڑھ دیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ایک سورۃ کی آیات تو معین تھیں اور اس طرح صحابہ کو یہ علم تو دیا گیا تھا کہ فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیات ہیں۔ مگر ہر ایک سورۃ کی آیات کی کوئی ترتیب معین نہ تھی تو یہ دعویٰ بھی اسی دلیل سے مردود ثابت ہوتا ہے جس سے وہ پہلا دعویٰ کہ سارا قرآن شریف ایک پریشانی کی حالت میں پڑا ہوا تھا غلط ثابت ہوتا ہے۔ ان دعاوی کی لغویت کو ثابت کرنے کے لیے اگر اور کوئی دلیل ہمارے پاس نہ بھی ہوتی تو صرف یہی ایک دلیل جس کی بنا معتبر سے معتبر روایات پر ہے کافی تھی کہ قرآن شریف حفظ کیا جاتا تھا کیونکہ بغیر ایک ترتیب کی پیروی کے حفظ کرنا محال تھا۔ مثلاً اسی دعوے پر غور کرو کہ ہر ایک سورۃ میں آیات تو معین تھیں مگر ان کی ترتیب معین نہ تھی۔ اب سو سو آیات کی بہت سی سورتیں موجود ہیں۔ پس اگر ان سو سو آیتوں میں کوئی ایک ترتیب نہ تھی اور ہر ایک لکھنے والا اور ہر ایک پڑھنے والا ایک الگ ترتیب کی پیروی کرتا تھا۔ تو سو آیات کی جداگانہ ترتیبیں اس قدر تعداد تک پہنچتی ہیں کہ لاکھ آدمیوں میں سے کوئی دو بھی ایک ترتیب پر متفق نہ ہو سکتے تھے اس صورت میں ہر ایک سورۃ گویا لاکھوں الگ الگ سورتیں تھیں اور قرآن کریم بھی ایک نہ تھا بلکہ لاکھوں الگ الگ قرآن شریف تھے۔ ایک لمحہ کیلئے بھی اگر ایک شخص حق طلبی اور خدا ترسی کو دل میں لے کر غور کرے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ بالکل محال تھا کہ بغیر ایک ترتیب کی پیروی کے قرآن شریف کی تعلیم اور تعلّم کا سلسلہ جاری رہ سکتا۔ نہ ہی ہزارہا صحابیوں میں سے ایک دوسرے کی نسبت یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے کونسا حصہ یا کونسی سورۃ پڑھ رہا ہے۔ اور واقعی صحیح پڑھ رہا ہے یا غلط۔ علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جب ایک شخص کوئی سورۃ یا کوئی حصہ کسی سورۃ کا پڑھتا اور اس سے کوئی غلطی ہو جاتی

یا کوئی آیت درمیان سے رہ جاتی تو سُننے والے معاً اس کی غلطی کو نکال دیتے۔ حالانکہ اگر ترتیب آیات کوئی نہ ہوتی تو یہ محال تھا کیونکہ کسی دوسرے کی نسبت کسی شخص کو کیا علم ہو سکتا تھا کہ وہ کس آیت کو پڑھتا ہے ایسی صورت میں غلطی کا نکالنا قطعاً ممکن نہ تھا +

ترتیب آیات ترتیب نزولی سے جُدا گانہ تھی

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے۔ کہ قرآن شریف کی آیات میں ضرور کوئی خاص ترتیب ملحوظ رکھی جاتی تھی جس کے موافق لوگ اُسے پڑھتے تھے اور حفظ کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ ترتیب ترتیب نزولی کے موافق تھی یا اس سے الگ کوئی اور ترتیب تھی۔ اس کا جواب معتبر تاریخی شہادت سے ہمیں یہی ملتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ترتیب نزولی سے الگ ایک ترتیب آیات کو دیا کرتے تھے۔ نزول آیات کے لحاظ سے ایسا ہوتا کہ بعض وقت ایک سورۃ کے کسی حصہ کے نزول کے بعد دوسری کسی سُورۃ کا حصہ نازل ہو جاتا۔ پس ایسی حالت میں نزُولی ترتیب ممکن نہ تھی۔ علاوہ ازیں صحیح روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ رکھا جاوے۔ جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ عن عثمان ابن عفان قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان ینزل علیہ من السور ذوات العدد فکان اذا انزل علیہ الشئی یدعو بعض من یکتب عندہ فیقول ضعوا ھذا فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب کئی سورتوں کی آیتیں نازل ہوتیں۔ تو آپ صریح طور پر اس موقعہ کی ہدایت فرمایا کرتے تھے جہاں کوئی آیت بلحاظ ترتیب رکھی جانی ضروری ہوتی۔ پس اس صریح اور مبین شہادت سے بھی یہ ظاہر ہے کہ آیات کی ترتیب خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تھی ایسی شہادت کی موجودگی میں کوئی سمجھدار آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ضرور آیات کو ترتیب دیتے تھے اور وہ ترتیب ترتیب نزولی سے جداگانہ تھی +

موجودہ ترتیب آیات ترتیب نبوی ہے

اب دو باتیں حل ہو چکیں یعنی ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیات قرآنی کو ترتیب دیتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ ترتیب ترتیب نزولی سے الگ تھی۔ اسلیے اب صرف تیسرا سوال حل کرنے کے قابل باقی ہے۔ کہ کیا وہ ترتیب جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دی اسی کے موافق موجودہ ترتیب آیات قرآنی کی ہے۔ یا یہ موجودہ ترتیب ترتیب نبوی سے الگ ہے۔ یہ امر تو بیّن ہے کہ موجودہ ترتیب بھی ترتیب نزولی سے الگ ہے جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ترتیب نزولی سے الگ ترتیب دی تھی۔ پس اگر کوئی شہادت اس امر کی نہ پائی جائے کہ قرآن کریم کی تاریخ میں کسی وقت آیات کی ترتیب کو بدلا گیا تھا تو نتیجہ قطعی اور یقینی ہوگا کہ موجودہ ترتیب بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے تاریخ قرآن کو ہم دو زمانوں پر تقسیم کرتے ہیں یعنی اول حضرت عثمانؓ سے پہلے اور دوم حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ اور آپ کے بعد۔ انھیں سے ایک زمانہ کے متعلق یعنی حضرت عثمانؓ کے زمانہ کے بعد جو زمانہ گذرا ہے اسکے متعلق تو اسلام کے کسی سخت سے سخت دشمن اور اندھے سے اندھے نکتہ چین نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ جو ترتیب حضرت عثمانؓ

کے وقت میں اور آپ کے شائع کردہ صحیفوں میں موجود تھی اس میں آج تک ایک سرِ مو کا فرق بھی آیا ہے پس اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن کریم کی ترتیب آج تک نہیں بدلی۔ اور وہی ترتیب سورتوں اور آیتوں کی اس وقت قرآن کریم میں موجود ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ کی ہدایت کے ماتحت دی گئی تھی اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لیکر حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ تک کسی موقعہ پر اصلی ترتیب کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ اور حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ کے صحیفوں میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھی۔ ایک موٹی سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی اتنی بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کو ترتیب کے بدلنے کے لیئے کوئی چیز محرک نہ تھی۔ یہ بات کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک خاص ترتیب قرآن شریف کی تلاوت میں ملحوظ رکھتے تھے اور اسی ترتیب پر صحابہ رضؓ نے قرآن شریف کو حفظ کیا ہم اُوپر دکھا چکے ہیں اور یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ ترتیب ترتیب نزولی سے الگ تھی۔ اب جو شخص یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے یا کسی اور شخص نے اس ترتیب کو جس پر (صحابہ اور حافظان قرآن کریم قائم ہو چکے تھے) تبدیل کر دیا تھا۔ یہ بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ ایسی تبدیلی کی شہادت پیش کرے۔ اور جب تک کوئی ایسی شہادت نہ ہو اس کا دعویٰ یقینی اور قطعی طور سے باطل ثابت ہوگا۔ مگر ہم جب حدیث صحیح کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک شمہ بھر بھی ایسی شہادت ہمیں نہیں ملتی۔ اور نہ ایسا یقین کرنے کے کوئی وجوہات پائے جاتے ہیں حضرت عثمان رضؓ کے وقت تک کوئی ایسا زمانہ نہیں گذر گیا تھا کہ سارے صحابہ رضؓ کے بالمقابل ایک آدمی کو یہ جرأت ہو سکتی کہ وہ اس ترتیب کو بدل دے جس پر سب قائم تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو فوت ہوئے ابھی بارہ سال ہی گذرے تھے اور ہزارہا صحابہ رضؓ اس وقت زندہ تھے جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منہ سے قرآن شریف سُنا ہوا تھا۔ اگر کوئی تبدیلی ترتیب میں اس وقت وقوع میں آتی تو ایسا واقعہ خاموشی سے نہ گذر سکتا تھا بلکہ ایک ایسا شور برپا ہوتا جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحوں کے صفحے بھر جاتے اور اوّل تو یہی بات سوچنے کی ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کو غرض کیا تھی کہ وہ ترتیب بدلتے۔ اور کونسی ضرورت پیش آئی تھی کہ ترتیب بدلی جاتی۔ نہ کوئی ضرورت پیش آئی نہ کوئی غرض کسی کی تھی نہ ہی اس امر کا کہ ترتیب بدل دی گئی تھی کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی ذکر پایا جاتا ہے پس ایسا دعوےٰ کہ حضرتِ عثمان نے ترتیب آیات کو بدل دیا تھا سراسر حماقت اور لغویت سے پُر ہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو صحیفے نقل کرائے وہ سارا ان کا اپنا یا زید کا کام نہ تھا بلکہ دیگر صحابی رضؓ بھی اس میں شامل تھے۔ اور وہ تمام صحابہ رضؓ جو حفظ قرآن شریف میں خاص شہرت رکھتے تھے انہی کی زیر نگرانی حضرت عثمان رضؓ نے یہ کام کرایا تھا اس کو بھی چھوڑو۔ ہم کہتے ہیں کہ کم از کم کوئی یہی دکھا دے کہ حضرت عثمان رضؓ پر اُس وقت کسی نے یہ الزام دیا تھا کہ آپ نے قرآن شریف کی سورتوں یا آیتوں کی ترتیب بدل دی ہے۔ اگر کوئی الزام آپ پر دیا گیا تو وہ یہ تھا کہ آپ نے مسلمہ قرأت کے سوا بعض اور قراتوں کو رد کیا مگر اسکی اصلیت کیا تھی ہم آگے چلکر دکھائیں گے۔ بہرحال آیتوں کی ترتیب کے بدل دیئے

کی ایک ذرہ بھر بھی شہادت موجود نہیں۔ اور ایسی شہادت کی عدم موجودگی میں یہ ماننا پڑیگا کہ قرآن شریف کی ترتیب آیات وہی رہی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھی +

سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کے ذکر سے ترتیب کا ثبوت

ایک امر کے قطعی ثبوت کے لیے دو ہی قسم کی شہادت ہو سکتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی تائید میں زبردست شہادت موجود ہو۔ قسم اول کی شہادت ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں اور یہ دکھا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تاریخ میں کوئی وقت بھی ایسا نہیں آیا۔ کہ جس میں اس کی آیتوں کے موجودہ انتظام میں کوئی ذرہ بھر بھی تغیر و تبدل واقع ہؤا ہو۔ اس قسم کے ثبوت کے علاوہ کثرت سے دلائل بدیہیہ یقینیہ قسم ثانی کے بھی موجود ہیں۔ جو اور بھی وضاحت سے اس امر کو بپایۂ ثبوت پہنچاتے ہیں۔ یہ وہ دلائل ہیں جو احادیث صحیحہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔ جیسے مثلاً حضرت امام بخاری علیہ الرحمۃ نے باب فضل سورۃ البقرۃ کے ضمن میں ایک حدیث نقل کی ہے۔ عن ابی مسعود رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم من قرأ بالآیتین من اٰخر سورۃ البقرۃ فی لیلۃ کفتاہ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی رات میں سُورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں پڑھے تو یہ اُس کے لیے کافی ہیں"۔ یہ حدیث جس کا یہاں ترجمہ دیا گیا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ میں منقول ہے۔ اس سے دو باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔ اولاً اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قرآن شریف کی ایک ترتیب کی نگہداشت فرماتے تھے۔ اور وہ ترتیب آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کبار رضی اللہ عنہم پر منکشف فرمائی۔ اور پھر ان سب کا اُسی ترتیب پر عمل رہا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) کسی سُورۃ کی آخری دو آیتوں کی طرف اشارہ نہ فرماتے۔ اور نہ ہی صحابہؓ آپ کے اس اشارہ کو سمجھ سکتے۔ یہ حدیث اِس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ہر ایک آیت قرآنی کے لیے ابتدا ہی سے ایک معین اور معروف مقام قرآن شریف میں ہے۔ اور کسی قاری یا حافظ یا عام پڑھنے والے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کی ترتیب میں ایک بال کے برابر بھی تبدیلی کر سکے۔ ثانیاً اس حدیث شریف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آج اس زمانہ میں سورۃ البقرۃ کا جن آیات پر خاتمہ ہوتا ہے وہی آیات سُورۃ البقرۃ کے خاتمہ پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد رحمت مہد میں شروع سے لکھی ہوئی تھیں۔ اور اس سے یہ بات بہت اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو شروع میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ اور جو آپ کی حیات میں عام طور پر استعمال میں آتی تھی اسی کی تائید میں ایک دوسری حدیث میں یُوں آیا ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ سے شروع ہو کر آخیر سُورۃ یعنی وانصرنا علی القوم الکافرین تک پڑھے جس سے اِس بات کی اور بھی واضح طریق سے تعیین ہوتی ہے کہ یہی دو آیتیں جواب سورہ بقرہ کے اخیر میں ہیں یہی دونوں مسلم اور مشہور طور پر آنحضرتؐ کے وقت میں بھی اِس سورۃ کی آخری آیتیں تھیں +

ایسا ہی ایک اور حدیث صحیح میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے زمانہ خروج دجال میں سورۃ الکہف کی پہلی

دس آیتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اب اس جگہ غور کا مقام ہے کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں قرآن شریف کی کوئی ترتیب موجود نہ ہوتی یا اصل ترتیب میں کوئی فرق اور تبدل واقع ہونیوالا ہوتا تو خروج دجال کے متعلق جو کسی آیندہ زمانہ میں ہونیوالا تھا اس وقت کے مسلمانوں کے لیے سورۃ الکھف کی پہلی دس آیتوں کا نشان دینا ایک بےمعنی بات ہوتی۔ اور اُن آیتوں کا پتہ ہی نہ ملتا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی منشاء اس حدیث میں تھی۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں وارد ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حفظ عشر آیات من اول الکھف عصم من الدجال۔ اس حدیث سے یہ بات مضبوط طور پر ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن شریف کی ایک ترتیب موجود تھی اور وہ ترتیب ہی آج تک غیر متبدل طور پر چلی آتی ہے۔ ان کے ماسواء اور بھی بہت سی حدیثیں اس مضمون پر موجود ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس بات کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہیں۔ تمام اسلامی لٹریچر میں ایک حدیث بھی ایسی نہ پاؤ گے کہ جس میں موجودہ ترتیب آیات قرآنی کے خلاف کسی اور ترتیب کا ذکر تو کیا اشارہ تک بھی موجود ہو۔ غرض ہر قسم کی سالبہ مثبتہ داخلی و خارجی گواہیوں سے یہ بات بلا گنجائش شک و وہم استثناء ثابت اور مبرہن ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کو خود جمع و مرتب فرمایا تھا اور وہی ترتیب بغیر کسی قسم کے تغیر و تبدل کے ہمیشہ مسلمانوں میں مستعمل اور مروج رہی اور آج تک موجود ہے۔ اور زمانہ موجودہ میں نسخہ جات قرآنی اسی ترتیب کے مطابق نہایت احتیاط کے ساتھ لکھے چھاپے اور شائع کیے جاتے ہیں۔ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو غیر مرتب چھوڑ جاتے تو ضرور تھا کہ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت میں مختلف ترتیبیں رواج پا جاتیں۔ اور اُن مختلف ترتیبوں کا اتنے کثیر التعداد ذخیرۂ احادیث میں کہیں نہ کہیں حوالہ یا اشارہ و کنایہ ہی موجود ہوتا۔ لیکن احادیث کے سارے دفتر تلاش کر لو۔ اسلامی تاریخ کی ایک ایک سطر چھان مارو۔ اس بات کا کہیں بھی ذکر تو کیا اشارہ بھی نہ پاؤ گے۔ جبکہ ساری اسلامی کتب احادیث میں یہ بات بطور اشارہ بھی کہیں موجود نہیں کہ اس ایک مسلمہ ترتیب آیات قرآنی کے سوا کوئی اور ترتیب قرآن شریف کی آیات کی کبھی کسی نے کی ہو تو یہ امر صریح طور پر ثابت ہے کہ قرآن شریف کی ترتیب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور وہی ترتیب صحابہؓ میں مروج تھی اور پھر وہی ترتیب نہایت احتیاط سے محفوظ ہو کر تمام اسلامی دنیا میں تا ایں دم مروج ہے۔ کہیں کسی جگہ کسی تبدیلی و تغیر کا ذکر نہیں +

سورہ کہف کی پہلی دس آیات کے ذکر سے ترتیب کا ثبوت

حضرت علی کا نزول کے مطابق ترتیب دینا

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک حدیث ایسی ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے قرآن شریف کو ترتیب نزولی کے موافق جمع کیا تھا لیکن اگر ہم فرض کے طور پر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیں تو بھی ہمارے مدعا کے خلاف نہیں بلکہ اسی نتیجہ کی تائید کرتی ہے جس پر ہم پہنچے ہیں۔ یعنی اسی بات کی موید ہے کہ موجودہ ترتیب قرآنی ہی ایک ترتیب ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مروج تھی۔ اگر حضرت علیؓ کا ترتیب نزولی کے مطابق قرآن شریف جمع کرنے کا بیان صحیح بھی ہے تو اس کا مذکور بغرض بیان واقعہ اختلاف ترتیب ہائے قرآنی نہیں کیا گیا بلکہ

اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ عام طور پر ترتیب نبوی مسلمانوں میں مُسلّم اور مُروّج ہو چکی تھی حضرت علیؓ کی طرف اس واقعہ کو محض بطور استعجاب بیان کیا گیا لیکن حضرت علیؓ کا اِس نزولی ترتیب کو کبھی عام طور پر مشتہر کرنے کا منشاء نہ تھا اور نہ ہی ان کا یہ منشاء تھا کہ اِس ترتیب سے قرآن کریم کی تلاوت کی جاوے*۔ ان کا منشا صرف اس قدر ہوگا کہ ایک تاریخی شہادت نزول کی موجود رہے۔ ہاں اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی تیسری ترتیب بھی موجود ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی کہیں نہ کہیں کسی پیرایہ میں موجود ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی طرف منسوبہ ترتیب پر کبھی عمل نہیں کیا کیونکہ آپ نے جو ترتیب کی تھی وہ وحی الٰہی کی بنا پر ربط و ضبط مضمون اور سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے کی تھی۔ وہ نزول آیات کے زمانہ کے لحاظ سے نہ تھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا ہوگا کہ نزول آیات قرآنی کی تاریخی ترتیب کو محفوظ کر لیا جائے چنانچہ اسی خیال کو دل میں رکھ کر انہوں نے ترتیب محولہ بالا کر چھوڑی ہوگی۔ یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی کہ حضرت علیؓ نے یہ ترتیب رواج دینے کی نیت سے کی ہو۔ بلکہ وہ خود اُسی ترتیب نبوی کے رواج کے مُؤید اور قائل تھے۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا اور یہ تجویز کیا گیا کہ قرآن شریف کے نسخے خاص نگرانی کے ساتھ لکھ کر لوگوں میں تقسیم کیئے جائیں۔ اور اس کام کا اہتمام ایک منتخب مجلس کے سپرد کیا گیا تو اُن منتظموں کی مجلس کے ارکین عظام میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تھے۔ اور فضیلت قرآن دانی کی وجہ سے آپ کا اِس بارہ میں بہت کچھ دخل تھا۔ انہوں نے اس وقت ہرگز ہرگز اس ترتیب کا ذکر بھی نہیں کیا جو انہوں نے وحی الٰہی کی تاریخ محفوظ کرنے کے لیے کی تھی۔ اور نہ ہی کسی اور ترتیب کا سوائے اس موجودہ ترتیب کے کوئی تذکرہ کیا بلکہ نہایت محنت شاقہ اور احتیاط کے ساتھ نبوی ترتیب کے مطابق قرآن شریف کے نسخے لکھوائے اور تصحیح کیئے اور کرائے۔ اور ان کو مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خیال میں اس کے سوائے کوئی اور ترتیب بھی ہوتی تو یہ بات ان کی شان سے بالکل بعید تھی کہ وہ خاموشی سے اسی ترتیب موجودہ کو اپنے معلومات اور کانشنس کے برخلاف لکھے جانے اور مُروّج کیئے جانے کی نہ صرف اجازت ہی دیتے بلکہ عقد ہمت باندھ کر اسی ترتیب نبوی کے مطابق قرآن شریف لکھاتے اور اس کو عام طور پر مسلمانوں میں رواج دینے کی کوشش کرتے۔ وہ تو ایسے دلیر اور شجاع تھے کہ کسی قسم کا دباؤ اور لحاظ ان کے سچے خیالات کے اظہار اور تعمیل سے ان کو نہ روک سکتا تھا۔ اسلیے اگر اُن کو کچھ اختلاف ہوتا تو فوراً اعتراض کر دیتے اور اگر اعتراض نہ کرتے تو کم از کم اس مجلس میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے۔ بلکہ برخلاف اس کے جس ترتیب پر تمام جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق اور عمل تھا جو موجودہ ترتیب قرآن کریم کی ہے۔ اسی پر بلا اعتراض حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی متفق اور عامل تھے۔ اوما و پر اسبات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ ترتیب نبوی در اصل ترتیب باقی ہے اور اس ترتیب سے بالکل مختلف ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ترتیب نزولی کے لحاظ سے وحی الٰہی کی تاریخ کا علم محفوظ رکھنے کے لئے کی تھی۔ قرآن شریف کے نزول کی ترتیب کو بغرض حفظ تواریخ محفوظ کر لینے میں کیا مضائقہ تھا؟ سوال تو صرف یہی تھا کہ آیا انہوں نے اِس ترتیب کو ترتیب قرآنی کے نام سے موسوم کر کے عام طور پر مُروّج کرنے کی کوشش تو درکنار ارادہ بھی کبھی کیا؟ لیکن ان کے قول و فعل سے نہ اُن کی اسبارہ

*جیسا کہ ہم پہلے دکھا چکے ہیں بعض وقت دو دو تین تین سُورتیں اکٹھی نازل ہوتی رہتی تھیں۔ ایسی صورت میں ترتیب نزولی آیات کی تو ممکن ہی نہ تھی +

میں کوشش ہی ظاہر ہوتی ہے اور نہ ہی اُن کا ارادہ ثابت ہوتا ہے۔ پس پھر کیونکر یہ ترتیب اس میدان میں ذکر کے قابل ٹھیر سکتی ہے۔ اس ترتیب کو تو قرآن شریف کی ترتیب ہی نہیں کہہ سکتے۔ اگر بالفرض یہ امر کسی طرح مانا جائے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن شریف کو ترتیب موجودہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رواج دینے پر کسی مصلحت سے سکوت اختیار کیا ہوگا۔ اگرچہ اُن کی شان میں ایسے گمان سے ان کی بے ادبی اور ہتک متصوّر ہے لیکن اگر یہ امر ایسا ہی ہوتا تو پھر اس کی اصلاح اور تلافی اس زمانہ میں بآسانی ہو سکتی تھی جبکہ خدا تعالے نے اُن کے اپنے سر پر خلافت کی عزت و جلال کا تاج رکھا۔ جب آپ کی خلافت کا زمانہ آیا تو اس وقت تو ان کے لیئے کوئی روک نہ تھی۔ اگر قرآن شریف کی مسلمہ و مروجہ ترتیب میں ان کو کوئی اختلاف ہوتا تو فوراً سب سے پہلے اسکی اصلاح کرنا ان کا فرض تھا۔ انھوں نے تو اپنے زمانہ خلافت میں بھی اُسی ترتیب کو رواج دیا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مروج تھی اور پھر جس کے مطابق انھوں نے خود حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن شریف لکھوائے اور تقسیم کیے تھے لیکن باوجود اتنے بڑے اقتدار اور رسوخ کے انھوں نے نہ تو خود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اور نہ ہی حضرات عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کی خلافتوں میں اور نہ ہی اپنے زمانہ میں اس ترتیب موجودہ پر (جو دراصل ترتیب نبوی ہے) اعتراض کیا۔ اور نہ کبھی خلوت میں اور نہ کبھی جلوت میں اس بات کا ذکر ہی کیا کہ موجودہ ترتیب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی کی ہوئی نہیں۔ اور نہ ہی کبھی یہ ذکر کیا کہ قرآن شریف کی آئتیں اور سورتیں جس ترتیب کے ساتھ موجود ہیں وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی تھی۔ بلکہ ترتیب نزولی صحیح ترتیب تھی اور اسی پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا +

ان تمام حالات سے یہ بات آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی سورتوں اور آیتوں کی وہ ترتیب جس کے مطابق حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن شریف کے نسخے مسلمانوں میں تقسیم کیئے گئے تھے حقیقت میں یہ وہی ترتیب ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے کیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس کے متعلق اختلاف موجود ہوتا۔ بعض روایات میں لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کو بعض کلمات کا خاص لہجہ میں پڑھنا بڑا مرغوب تھا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کا اس طرح پڑھنا ناجائز قرار دیا۔ اس پر حضرت ابن مسعودؓ حضرت عثمانؓ سے کشیدہ خاطر ہو گئے لیکن باوجود اس کشیدہ خاطری کے انھوں نے کبھی کسی وقت اس ترتیب آیات قرآنی پر کوئی جرح و اعتراض نہیں کیا جس کے مطابق حضرت عثمانؓ کے حکم سے قرآن شریف لکھے اور تقسیم کیئے گئے تھے۔ نہ ہی انھوں نے کبھی ظاہر کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کے سوا کوئی اور ترتیب آیات قرآنی مروج تھی +

ہر نئی نازل شدہ آیت کی جگہ آنحضرت خود بتاتے تھے۔

ان مذکورہ بالا واقعات سے یہ امر قطعی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی سورتوں کی تقسیم اور ہر ایک سورۃ میں آیتوں کی ترتیب جیسے کہ فی زمانہٖ موجود ہے سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی تو ساتھ ہی آپ اس کے قرآن شریف میں لکھے جانے کے لیے جگہ بھی مقرر فرما دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی صحابی نے اپنے خیال کے موافق کسی آیت کو قرآن شریف میں کسی جگہ لکھنے کی جرأت نہیں کی۔ اور نہ کسی کو ایسا کرنے کا حق پہنچتا تھا۔ مثلاً سورۃ البقرہ جس کو قرآن شریف

میں دوسرا نمبر حاصل ہے اس کا اکثر حصہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے ابتدائی حصہ میں نازل ہوا تھا لیکن اس کی بعض آیتیں دیر سے نازل ہوئی تھیں جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ وہ آیات جو ممانعت ربوا کے متعلق ہیں آپ کے آخری ایام میں نازل ہوئیں۔ یہ آیتیں ترتیب میں ان آیات کے پیچھے رکھی گئی ہیں جو خیرات اور صدقات کے متعلق ہیں۔ اب ان آیات کو جن میں صدقات و خیرات کے احکام ہیں۔ اور ان آیات کو جن میں ربوا کی ممانعت ہے ایک جگہ لکھنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ دونوں احکام غرباء اور مساکین کے فائدے اور آسانی کے لیئے دو ذریعے ہیں۔ جن سے ایسے لوگوں کی بہبودی متصوّر ہے جس موجودہ سوسائٹی کی قرآن شریف نے اصلاح کرنی تھی اسکی حالت اس وقت ایسی تھی کہ دونوں احکام کا متفرق اوقات میں دیا جانا ضروری تھا۔ جن لوگوں کو اکل ربوا سے منع کرنا تھا ضروری تھا کہ ان میں پہلے اس حکم کے ماننے کی استعداد پیدا کر دیجاتی۔ اس لیئے ایک حکم پہلے دیا گیا جو اس راہ میں ایک بڑی بھاری اور پہلی منزل تھی۔ پھر جب اس حکم کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی استعداد ان میں پیدا ہو گئی۔ اور اس پر شرح صدر سے عمل کرنا ان لوگوں پر آسان ہو گیا۔ تو پھر دوسری منزل ان پر منکشف کی گئی یعنی دوسرا حکم انہیں دیا گیا حقیقت میں یہ دونوں احکام آپس میں بہت گہرا رشتہ رکھتے ہیں اور ضروری تھا کہ بلحاظ ربط مضمون وسیاق عبارت اسی ترتیب کے ساتھ اکٹھے جمع کیئے جائیں +

احادیث میں حوالۂ آیات بقید نمبر شمار

ایک اور بات اِس امر پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر احادیث میں آیات قرآنی کے حوالے بقید نمبر شمار دیئے ہوئے ہیں۔ اور ایسی باتے ہیں جس سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ ترتیب آیات قرآنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مکمل ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے مدّعا کی تائید میں کچھ مثالیں اوپر پیش کی ہیں اس جگہ ایک اور مثال اسی ذیل میں پیش کیجاتی ہے تاکہ ہمارے ناظرین پر یہ امر ذرا اور واضح ہو جائے۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث وارد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک دفعہ نماز میں سورۃ انفال کی چالیس آیات پڑھیں۔ پھر اسی حدیث کو محدّث عبد الرزاق نے بھی ایک اور سلسلہ رواۃ کی روایت سے نقل کیا ہے فرق دونوں میں صرف اس قدر ہے کہ دوسری روایت میں بجائے اس ذکر کے کہ ابن مسعودؓ نے چالیس آیتیں پڑھیں یہ ذکر ہے کہ سورۃ انفال کو اس موقع تک پڑھا جہاں ءِ نعم النصیر (دیکھو فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۱۲) اب جب ہم اس سورۃ کی چالیس آیتیں شمار کرتے ہیں تو آخری آیت جن الفاظ پر ختم ہوتی ہے وہ وہی الفاظ ہیں جو محدّث عبد الرزاق نے اپنی حدیث میں لکھے ہیں۔ گویا یہ دونوں بیان باہم متوافق ہیں اسبات سے یہ امر بہت عمدگی سے پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قرآن شریف جس ترتیب کے ساتھ آج کل ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہی ترتیب زمانہ حضرت رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم میں مروّج اور معروف تھی۔ ایسے ہی ایک اور حدیث بخاری سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نماز تہجد کے لیئے اُٹھتے وقت سورۃ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھا کرتے تھے۔ اور چونکہ آپ کی پیروی میں مسلمان بھی یہ آیتیں پڑھتے تھے۔ اسلیئے تعامل نے ہمیں یہ موقعہ دیدیا ہے کہ اُس ترتیب کا مقابلہ موجودہ ترتیب سے کر سکیں۔ اب تعامل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب آیتیں تورات کو اٹھ کر

پڑھی جاتی ہیں وہ ہیں ان فی خلق السموات والارض سے شروع ہو کر اخیر سورۃ تک چلتی ہیں اور جب موجودہ ترتیب کو دیکھتے ہیں تو یہی آیتیں اب بھی آل عمران کی آخری آیتیں ہیں۔ اسبات سے بھی یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن شریف کی یہی ترتیب مروج اور مستعمل تھی جو آج کل مروج ہے۔ اور یہ کہ سورتوں کی تقسیم بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں ہو چکی تھی +

تلاوت وحفظ قرآن بغیر ترتیب سُور ناممکن تھا

اس کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ سورتوں کی ترتیب ہے۔ اس مسئلہ پر بحث کرنے کیلئے سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سوائے اُس حال کے جبکہ سارے قرآن شریف کی تلاوت کرنا منظور ہوتا نمازوں میں یا نمازوں کے باہر قرآن کریم پڑھنے کے لیے یہ امر ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا کہ سورتوں کی ترتیب کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔ ہم نے اوپر احادیث کی سند سے ثابت کیا ہے کہ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت میں بہت سارے ایسے بزرگ موجود تھے جن کو سارا قرآن شریف ازبر تھا۔ اور وہ لوگ اپنے اپنے حافظوں میں تر و تازہ اور ضبط رکھنے کیلئے ہمیشہ تلاوت کرتے رہتے اور مقررہ مدت میں ختم کیا کرتے تھے چنانچہ اسی پر صحیح بخاری میں ایک باب باندھا ہوا ہے جس کا عنوان یہ ہے "کتنی مدت میں قرآن شریف ختم کرنا چاہیئے"۔ اس باب کے ضمن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دی ہیں جن میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو تین دن سے کم عرصہ میں قرآن شریف کا ختم کرنا منع فرمایا تھا۔ اور ایک دوسرے صحابی کو سات دنوں سے کم عرصہ میں قرآن شریف کا ختم کرنا منع کیا۔ ان حدیثوں سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سارا قرآن شریف حفظ تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ اور معمولاً سات دنوں میں ختم کیا کرتے تھے۔ قرآن شریف جتنی بڑی کتاب ایسے محتاط طریق سے حافظہ میں جب ہی محفوظ رہ سکتی تھی کہ اس کی تلاوت پر مداومت کی جائے۔ چنانچہ خود سرور کائنات صلعم نے فرمایا کہ قرآن شریف کو یاد رکھنے کے لیے اسکی ہمیشہ تلاوت کرتے رہنا چاہیئے ورنہ یاد نہیں رہیگا اسلیئے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت کرتے تھے۔ اب اس بات کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ کہ قرآن شریف کو بار بار پڑھنا اور ہر دفعہ ایک معینہ مدت کے اندر ختم کرنا اس امر کا متقاضی ہے کہ اسکی سورتوں کی کوئی ترتیب اور تقسیم موجود ہو۔ ورنہ مداومت کے ساتھ پڑھنا اور ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا حدیث شریف بھی اسکی تائید کرتی ہے کہ نہیں؟ اس کے متعلق اس قدر لکھنا کافی ہے کہ احمد۔ ابوداؤد وغیرہم نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سورتوں کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی ہم اس جگہ اس حدیث کو نقل کرتے ہیں وہ یہ ہے۔ عن اوس ابن ابی اوس حذیفۃ الثقفی قال کنت فی الوفد الذین اسلموا من ثقیف فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرأ علی حزبی من القرآن فاردت ان لا اخرج حتی اقضیہ قال فسالنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبہ ثلاث سور وخمس سور وسبع سور وتسع سور واحدی عشرۃ وثلاث عشرۃ وحزب المفصل من ق حتی تختم۔ اوس فرماتے ہیں کہ ثقیف کے اُس وفد میں جو اسلام قبول کرنیوالے تھے میں بھی موجود تھا آنحضرت نے ہم کو

قرآن شریف کی سات منزلوں سے ترتیب سور پر دلیل

کہا کہ میں نے اپنی قرآن شریف کی منزل کو پورا کرنا ہے۔ اسلئے میں ارادہ کرتا ہوں کہ جب تک ختم نہ کروں اس وقت تک باہر نہ نکلوں۔ اس پر ہمنے اصحاب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کس طرح قرآن کو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ کہ تین سورتوں اور پانچ سُورتوں اور سات سورتوں اور نو سورتوں اور گیارہ سورتوں اور تیرہ سُورتوں اور ق سے شروع ہو کر اخیر قرآن تک جس کو مفصل کہتے ہیں (سات حصّے ہیں) +

معتبر روایتوں اور معقول وجوہ سے ثابت ہے کہ حدیث صحیح ہے۔ اسکے رُو سے قرآن شریف کے سات حصّے یعنی سات منازل ہیں ہر منزل ایکدن میں پڑھی جاتی ہے اور اس طرح سے سارا قرآن شریف سات دنوں میں ختم ہوتا ہے۔ دوسری معتبر صحیح احادیث میں آیا ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی کہ قرآن شریف سات دنوں میں ختم کیا کریں اس حدیث کے راوی پہلی حدیث کے راویوں سے جُدا ہیں۔ ان دونوں مضمون واحد کی حدیثوں کا مختلف راویوں کی روایت سے بیان ہونا ایک دوسرے کی صداقت پر دلیل ہے۔ اسلئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان حدیثوں کی صحت میں کسی قسم کے شک کو جگہ دیجائے۔ اب ہمیں یہ صاف نظر آرہا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث سے سورتوں کی ترتیب کا وجُود واضح طور پر ثابت ہے۔ کیونکہ وہی منزلیں جن میں قرآن شریف کے اس حدیث کے رُو سے حصّے کیئے ہوئے ہیں آج تک مسلمانوں میں مروّج ہیں۔ اور ساری اسلامی دُنیا اسی پر کاربند اور عامل ہے۔ پس اس تعامل سے بھی صاف شہادت اس حدیث کی صداقت کی ملتی ہے۔ ان سات حصّوں کو مسلمانوں کی اصطلاح میں سات منزلیں کہتے ہیں اور ہر ایک منزل میں اسی قدر سُورتیں ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ جیسے کہ حدیث شریف میں لکھا ہے ساتویں منزل ٹھیک اس کے مطابق سورۃ ق سے شروع ہوتی ہے پہلی چھ منزلوں میں کُل اڑتالیس سُورتیں ہیں اور یہی وہ تعداد ہے جو احادیث سے ثابت ہے اس جگہ ایک بات ناظرین کو یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیث مذکورۃ الصدر میں سُورۃ فاتحہ جو قرآن شریف میں سب سے پہلے لکھی ہوئی ہے شمار نہیں کی گئی۔ اور یہ امر کسی غلطی پر مبنی نہ تھا۔ پس سُورۃ بقرہ سے شروع کر کے تین سُورتوں کی ایک منزل پھر اس کے بعد کی پانچ سورتوں کی دوسری منزل۔ پھر اس کے بعد کی سات سورتوں کی تیسری منزل پھر اس کے بعد کی نو سورتوں کی چوتھی منزل پھر اس کے بعد کی گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل پھر اس کے بعد کی تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل اور ق سے (جو اُنچاسویں سورۃ ہے) شروع ہو کر اخیر تک ساتویں منزل ہوتی۔ اگر فاتحہ کو شامل کر کے شمار کیا جائے تو اس حساب سے سورۃ ق پچاسویں سُورۃ ہوتی ہے۔ اور اگر اسکو شامل نہ کیا جائے تو پھر سُورۃ ق اُنچاسویں سُورۃ ہوتی ہے۔ اور اس حدیث میں موخر الذکر حساب کو ملحوظ رکھا گیا ہے یعنی پہلی چھ منزلوں میں اڑتالیس سُورتیں اور پھر اُنچاسویں سُورۃ ق سے ساتویں منزل شروع ہوتی ہے جس طرح ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ آیات قرآنی کی ترتیب خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اسی طرح اس حدیث سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ قرآن کریم کی سُورتوں کی ترتیب بھی آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود کی تھی۔ اور آج تک اسی ترتیب پر مسلمان قائم ہیں۔ یعنی موجودہ ترتیب جو مسلمانوں میں مروّج اور جاری ہے۔ وہ بجنسہٖ اور بلا تفاوت وہی ترتیب ہے جس میں ایک سر مو بھی فرق نہیں آیا +

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جبکہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک پورے طور پر نازل نہیں ہو چکا تھا۔ اور آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے آخری زمانہ تک آیتیں اور سُورتیں نازل ہوتی رہی تھیں تو پھر کسی

ترتیب کا وجود ہی کیونکر حیطۂ امکان میں آسکتا ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے۔ کہ جب تک مورد وحیٔ خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) زندہ رہے اُس وقت تک قرآن شریف کا نزول مکمل نہیں سمجھا جاسکتا لیکن اس بات سے آیتوں اور سُورتوں کی ترتیب میں کوئی فرق اور ہرج واقع نہیں ہوتا۔ جتنا حصّہ قرآن شریف کا نازل ہو چکتا تھا۔ اس کو بھی قرآن ہی کہا جاتا تھا اور لفظ قرآن کے معنوں میں یہ بات آسکتی ہے لیکن اِس حدیث میں بنی ثقیف کے اسلام لانے کا حال درج ہے پس یہ اُس وقت کی حدیث ہے۔ جب وہ لوگ اِسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اب یہ ثابت ہے کہ ثقیف ہجری کے نویں سال میں مسلمان ہُوئے تھے۔ اور اُسی سال میں سُورۃ توبہ نازل ہُوئی تھی جو تاریخی سلسلہ نزول میں سب سے اخیر سورۃ تھی۔ اسلئے اس حدیث کے زمانہ میں مذکورہ بالا اعتراض باقی نہ رہا تھا۔ کیونکہ جس زمانہ کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ اُس زمانہ میں قریبًا سارا قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ اور اس میں جو سُورتوں کی تقسیم کے بارہ میں ذکر ہے۔ اس سے تو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی سند سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُس پر کوئی اعتراض معقُول خیال نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ بعض آیات اس کے بعد نازل ہُوئیں لیکن جتنی آیات بعد میں نازل ہُوئیں وہ سب جہاں وحی الٰہی نے ہدایت کی وہاں رکھ دی گئیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ایک چھوٹی سی سُورۃ جس کا نام سورۃُ النصر ہے اس کے بعد نازل ہُوئی۔ لیکن یہ ایک چھوٹی سی سُورۃ تھی اور اسکو مناسب جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ ناظرین اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اس حدیث میں صرف چھ پہلی منزلوں کی سُورتوں کی تعداد بیان کی گئی ہے لیکن آخری منزل کی سُورتوں کی تعداد نہیں بیان کی۔ اِسکی نسبت صرف اِتنا ہی کہا گیا کہ ق سے شروع ہو کر خاتمہ تک ساتویں منزل ہے۔ کیونکہ ابھی اِس آخری منزل میں ایک سُورۃ شامل ہونا باقی تھی۔ چنانچہ وہ بھی نازل ہو کر شامل منزل ہفتم ہو گئی۔ اِس سُورۃ کے نزول اور ساتویں منزل میں شمول سے اس شمار میں ہرگز کوئی فرق نہیں آیا جو پہلی چھ منزلوں کے متعلق بیان ہُوا ہے +

حضرت عائشہؓ کی شہادت کہ ترتیب نزول اصل ترتیب قرآنی نہیں

اِس بات کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں کہ سُورتوں کی ترتیب کو آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکرؓ یا عثمان رضی اللہ عنہما نے کسی طرح تبدیل کر دیا ہو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برخلاف تو کبھی کسی نے کوئی اعتراض اس قسم کا نہیں کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے نقش قدم پر چلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو نقلیں قرآن شریف کی کی گئی تھیں وہ ان بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی اور اہتمام میں تیار کرائی گئی تھیں جن کو علم قرآن میں زیادہ ماہر اور واقف مانا گیا تھا۔ اور اکثر ان میں حضرت ابی ابن کعب جیسے بزرگ تھے جن کو قرآن شریف ازبر تھا۔ علاوہ ازیں جو دلائل میں نے اوپر قرآنی آیات کی ترتیب کے متعلق پیش کی ہیں وہی دلائل مناسب تغیر کے ساتھ قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب پر حاوی ہوتی ہیں لیکن چونکہ بعض حدیثوں میں مختلف ترتیبوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ اسلئے اِس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق بھی فیصلہ کر دیا جائے۔ اِس بارہ میں سب سے پہلے صحیح بخاری کے باب تالیف القرآن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اِس باب میں جو احادیث درج ہیں اُن میں سب سے پہلی حدیث یُوں ہے عن یوسف بن ماھک قال انی عند عائشۃ ام المومنین رضی اللہ عنہا اذ جاءھا عراقی فقال ای الکفن خیر۔ قالت ویحک وما یضرک۔ قال یا ام المؤمنین

اریني مصحفك قالت لم قال لعلي اولف القرآن عليه فانه يقرأ غير مؤلف قالت وما يضرك ايه قرأت قبل انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول شئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا لقد نزل بمكة على محمد صلى الله عليه وسلم واني لجارية العب بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر وما نزلت سورة البقرة والنساء الا وانا عنده قال فاخرجت له المصحف فاملت عليه اى السور۔ اِس حدیث کا ماحصل جہاں تک ہمارے مضمون سے تعلق ہے یہ ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک شخص عراق سے حاضر ہُوا اور عرض کیا کہ اپنے قرآن شریف کی مجھے زیارت کرائیں۔ حضرت ام المومنینؓ نے سوال کیا کہ تمہاری غرض اس سے کیا ہے؟ اس نے جواب میں گذارش کیا کہ قرآن شریف کی تلاوت میں کسی ترتیب کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور میں آپ کا قرآن اسلئے دیکھنا ہوں کہ میں اس مقدس کتاب کی صحیح ترتیب سے آگاہ ہو جاؤں۔ اِس پر حضرت ام المومنین نے اسے ملامت کی اور کہا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ کوئی حصہ پہلے پڑھا جائے۔ حقیقت میں اس کا جو حصہ پہلے نازل ہُوا تھا وہ مُفصّل سُورتوں میں سے ایک سورۃ تھی جس میں بہشت اور دوزخ کا مذکور تھا۔ لیکن جب اسلام کا چرچا بڑھا اور لوگ داخل ہونے شروع ہوئے تو پھر جواز اور ممانعت کے احکام نازل ہونے لگے۔ اگر سب سے پہلے یہی حکم نازل ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑینگے اور اگر سب سے پہلے یہ نازل ہوتا کہ زنا مت کرو تو وہ انکار کرتے۔ یہ باتیں کر کے پھر حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا اپنا قرآن نکال لائیں اور بعض سُورتوں کی آیتیں اس کو پڑھ کر سُنائیں"۔ اِس حدیث سے ظاہر ہے کہ ترتیب قرآن کے متعلق ایک عراقی نے حضرت عائشہ کے سامنے اپنا اعتراض پیش کیا۔ یہ شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سے نہ تھا اور نہ ہی کوئی دیر کا مسلمان تھا بلکہ ایک نومسلم تھا جسے ابھی قرآن شریف سے چنداں واقفیت بھی حاصل نہیں ہُوئی تھی۔ اِسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بھی درج ہے عراقی کی یہ بات کہ قرآن شریف کی کوئی ترتیب تلاوت میں ملحوظ نہیں رکھی جاتی محض ایک بیہودہ بات تھی اور اس کی نادانی کی وجہ سے پیدا ہُوئی تھی۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضؓ اُسے ملامت کرنے پر مجبور ہوئیں۔ پھر اُسے اس بات کی ضرورت کو سمجھایا کہ کیوں ترتیب نزُولی کے مطابق قرآن شریف نہیں لکھا گیا بلکہ اس سے مختلف ترتیب رکھی گئی حضرت عائشہ رضؓ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے یہ سوال کیا تھا کہ کیوں قرآن شریف نزُولی ترتیب کے مطابق نہیں لکھا جاتا کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ نے اس کے سوال کا جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں کہ کوئی آیت جو پہلے نازل ہو چکی ہو کسی مابعد کی آیت کے پیچھے رکھی جائے۔ جو جلد قرآن شریف کی حضرت عائشہ نے اُس عراقی کو دکھلائی تھی اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی ترتیب نزولی ترتیب سے مختلف تھی۔ اور یہ بات اِس امر سے بھی زیادہ واضح ہوتی ہے کہ اپنی بات کی تائید میں حضرت عائشہ رضؓ نے کئی سورتوں میں سے مختلف آیتیں اس کو پڑھ کر سُنائیں۔ اور اتنی دیر تک اُس کو

سمجھاتی رہیں کہ اُس عراقی کے ذہن نشین ہو کر اس کی خوب تسلی ہو گئی۔ اور حضرت عائشہؓ سے قرآن شریف کو دوسرے قرآنوں کے موافق پا کر اُلٹا خالی پھر گیا اور قرآن شریف ساتھ نہ لیگیا۔ کیونکہ اگر دوسرے مُروجہ قرآنوں سے اُس کی ترتیب مختلف ہوتی تو ضرور تھا کہ وہ شخص اس قرآن شریف کو ساتھ لیجاتا ✦

نمازوں میں ترتیب ملحوظ نہ رکھی جاتی تھی

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے صرف سارے قرآن کی تلاوت کے موقع پر ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ اور نمازوں میں قرآن شریف پڑھنے کے وقت یا نمازوں کے باہر جب تھوڑا تھوڑا حصہ پڑھنا منظور ہوتا تھا تو اس وقت اس ترتیب کے لحاظ رکھنے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً نمازوں میں اس ترتیب کی نگہداشت کی ضرورت نہیں اگر ایک پہلی رکعت میں کوئی سورۃ یا کسی سورۃ کا کوئی حصہ پڑھا جائے۔ تو دوسری رکعت میں اس بات کی پابندی نہیں کہ اسی حصہ سے آگے کا حصہ مسلسل طور پر پڑھا جائے بلکہ جہاں کہیں سے جس سورۃ یا سورۃ کے حصہ کو چاہے پڑھ لے حدیثوں میں اس کی کثرت سے شہادت موجود ہے۔ اسی طرح دو یا دو سے زیادہ سورتیں کسی ایک رکعت میں پڑھ لیجاتی تھیں اور بعض حالات میں نمازوں میں پڑھنے کے لئے ایسی سورتوں کو جمع کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں عموماً بیس سورتیں پڑھا کرتے تھے جن میں اٹھارہ تو آخری منزل قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں تھیں جن کو مفصل کہتے ہیں۔ مفصل سورتیں سورۃ ق سے شروع ہوتی ہیں۔ اور دو سورتیں حٰم سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی تہجد کی دس رکعتوں میں یہ بیس سورتیں اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ ہر رکعت میں دو دو سورتیں پڑھتے تھے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص تالیف فرمائی تھی جو حضرت ابن مسعودؓ کے ذریعہ ہم تک محفوظ ہو کر پہنچی ہیں اور جس کو تالیف ابن مسعود کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس تالیف کو قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی اس پر ہمیشہ عملدرآمد کیا جاتا تھا۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ اس ترتیب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز میں ایک یا ایک سے زیادہ مرتبہ ان سورتوں کو پڑھا اور چونکہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابہ بھی رضی اللہ عنہم اجمعین نمازوں میں قرآن شریف کی معمولی ترتیب کو ملحوظ نہ رکھا کرتے تھے تو اس تالیف سے اصل ترتیب قرآنی کی قدر و منزلت میں کچھ بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا ذکر ہی اسلیے کیا گیا کہ یہ اصل ترتیب سے علیحدہ تھی۔ نہ صرف تہجد کی نمازوں تک ہی یہ بات محدود تھی بلکہ عام نمازوں میں بھی سورتوں کی ترتیب معمولہ کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ جیسے مثلاً ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے قرآن شریف کی چوتھی سورۃ یعنی سورۃ النسا پہلی رکعت میں پڑھی۔ اور دوسری رکعت میں تیسری سورۃ یعنی آل عمران پڑھی۔ اس واقعہ کے درج کتب ہونے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اصل ترتیب سے اختلاف کی مثال محفوظ رہے۔ اس قسم کی بہت ساری مثالیں کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ اور چونکہ یہ امر لازمی نہ تھا کہ نمازوں میں قرأت کے وقت مسلمہ ترتیب کے موافق ہی قرآن کریم کی سورتیں پڑھی جائیں۔ اسلئے ان واقعات کے تحریر میں مقید اور محفوظ کئے جانے سے اس حقیقت کی تصدیق کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی سارے قرآن کی تلاوت کے وقت یہی ترتیب سور تھی جو قرآن کریم میں مُروج اور مستعمل تھی جس پر آجکل مسلمانوں کا عمل ہے ✦

تالیف ابن مسعودؓ

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ تالیف ابن مسعود کی بیس سورتیں جنہیں مفصل کہا جاتا ہے کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس بات کو دیکھ کر بعض لوگوں نے بے سمجھی سے یہ خیال کر لیا ہے کہ گویا حضرت ابن مسعودؓ کے پاس جو نسخہ قرآن شریف کا تھا اس میں سورتوں کی ترتیب دوسرے نسخوں سے مختلف تھی۔ اس بات کی تائید میں صرف یہی ایک حدیث پیش کیجاتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اور جس میں بیس چھوٹی چھوٹی سورتوں کے نماز تہجد میں پڑھے جانے کی تالیف کا ذکر ہے لیکن جب ہمیں اس بات کا ثبوت صاف صاف ملتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب مروجہ کا لحاظ نمازوں میں ضروری نہیں سمجھا گیا تھا تو اس شہادت کا کچھ اثر اصل ترتیب قرآنی پر نہیں پڑتا۔ اور اگر فرض محال کے طور پر اس بات کو مان بھی لیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کا کسی اور ترتیب سور قرآنی پر عمل تھا۔ اور اسی اپنی ترتیب کے مطابق ہی انہوں نے اپنا قرآن شریف لکھا ہوا تھا۔ تو اس سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ ان کی ترتیب ہی صحیح تھی۔ اور جو قرآن شریف حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس تھے اور عام طور پر مسلمانوں میں مروج تھے۔ اُن میں غلط ترتیب سے سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اگر ابن مسعودؓ کی کوئی جدا ترتیب تھی تو وہ انہیں تک محدود رہی کسی صحابی نے اس کیطرف کبھی التفات بھی نہیں کیا۔ بلکہ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت نے اسی بات پر اتفاق کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو نسخے قرآن کریم کے لکھوائے جو حضرت ابوبکر کے وقت میں جمع کئے ہوئے صحیفے سے نقل کیئے گئے تھے وہ اس ترتیب کے مطابق تھے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ اور جس پر حضور ممدوح صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قرآن شریف کی نقلیں کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس اہتمام کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما وغیرہم جیسے اولوالعزم اور بلند شان قرآن دان صحابہؓ نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خدمت کے لئے بارہ صحابی منتخب کیئے جن کا مفصل ذکر آگے آئیگا۔ یہ وہ بزرگ منتخب کیئے گئے تھے جو قرآن فہمی و قرآن دانی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے ان بارہ بزرگوں نے نہایت احتیاط اور جانفشانی سے اس خدمت کو ادا کیا۔ وہ اس بات سے بیخبر نہ تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تہجد کی نمازوں میں بیس چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ نماز میں قرآن شریف کی مروجہ اور مسلمہ ترتیب کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نمازوں میں سورتوں کی ترتیب کا لحاظ نہ رکھتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی یہ معظم و مکرم جماعت جن کو قرآن دانی میں کمال دسترس رکھنے کی وجہ سے اس عظیم الشان خدمت کے لئے صحابہؓ کی متفقہ رائے سے انتخاب کیا گیا تھا ان کی نسبت یہ گمان کرنا کہ جس بات کو حضرت ابن مسعودؓ جانتے تھے اس سے وہ بیخبر تھے۔ ایک نہایت ہی عبث بات ہے جو کسی عقلمند دماغ میں گنجائش نہیں پا سکتی۔ اور طرفہ اس پر یہ کہ اس امر کے جاننے والے صرف اکیلے حضرت ابن مسعودؓ ہی ہوں۔ اور اتنی قوم صحابہؓ میں سے ایک بھی ان کی تائید یا تصدیق کرنیوالا نہ ہو۔ البتہ اگر سورتوں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ترتیب کر جاتے اور ان کی ترتیب شخصی اختیار پر چھوڑی جاتی تو اس حال میں اس قیاس کو جگہ ہو سکتی تھی کہ وہ ترتیب جو بزعم معترضین حضرت ابن مسعودؓ نے کی تھی اس کی صحت اور عدم صحت پر غور کیا جائے۔ اور اس بات کو بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ ان کی ترتیب دوسرے صحابہؓ کی ترتیب

کی نسبت صحیح ہے یا کہ اُن کی ہی صحیح ترتیب ہے اور دوسری ترتیب صحیح نہیں لیکن اس قضیہ کا فیصلہ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہونا تھا۔ نہ کہ شخصی آراء پر۔ اب اسبات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ مذکورہ بالا تالیف ابن مسعودؓ سے علاوہ حضرت ابن مسعودؓ نے قرآن شریف کی باقی سُورتوں کو کسی اور طریق سے ترتیب دیا تھا۔ اور ان چند سورتوں میں بھی انہوں نے صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تہجد کی نمازوں میں پڑھتے سنکر خیال کر لیا کہ یہی صحیح ترتیب ہے مگر یہ خیال اُن کا غلط تھا۔ نہ تو یہ ہی ثابت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بات کو تحقیق ہی کیا اور نہ کسی اور صحابی سے ہی پوچھا۔ صرف اپنے خیال کو دخل دے کر ایک بات کا یکطرفہ فیصلہ کر لیا۔ اور اسی لئے ان کے نام سے ہی یہ تالیف منسوب ہے لیکن اس قیاس کو جگہ دینے میں انہوں نے غلطی کھائی ہے۔ صحیح احادیث موجود ہیں جنمیں لکھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک رکعت میں کسی سُورۃ کا کوئی حصہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور پھر اُس کے بعد کی دوسری رکعت میں کسی اَور سورۃ کا کوئی حصہ پڑھ لیتے تھے۔ اور اس بات کا مضائقہ نہیں رکھا جاتا تھا کہ پچھلی رکعت میں جو سُورۃ یا اس کا حصہ پڑھا جاتا وہ اصل ترتیب قرآنی کے موجب پہلی رکعت میں پڑھے ہوئے حصہ سے آگے کا حصہ ہوتا یا پیچھے کا۔ ابن مسعودؓ نے کسی ایسی تالیف پر ایک جُدا ترتیب کی بنا رکھدی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض وقت کی نمازوں میں ظاہر ہوئی۔ انہوں نے اپنے فیصلہ کی اسکو بنا ٹھیرانے میں سخت غلطی کھائی۔ لیکن عام اصولی لحاظ سے اُن کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن کی ترتیب سے کچھ چنداں مختلف نہ تھی۔ جیسے حضرت عثمان کے قرآن میں طوال یعنی لمبی سُورتیں ابتدا میں لکھی ہوئی تھیں اسی طرح انہوں نے بھی ان کو پہلے ہی لکھا ہوا تھا۔ البتہ اتنا فرق بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے سورۃ النساء کو سُورۃ آل عمران سے پہلے رکھا تھا۔ گویا تیسری سورۃ کو چوتھے اور چوتھی کو تیسرے نمبر پر رکھا۔ اب یہ بھی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکدفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سُورۃ نساء کو آل عمران سے پہلے پڑھا تھا سو غالباً اسی سے حضرت ابن مسعودؓ نے رائے قائم کر لی ہوگی۔ اب صرف یہی دو اختلاف ہیں جو ان کی ترتیب میں پائے جاتے ہیں جن پر معترض شور مچاتے ہیں۔ یا اگر کوئی اور اختلاف ہوگا تو وہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے کہ ترتیب کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہُوا اور اس اختلاف پر بحث و تنقید بھی ہوئی اور پھر وہی ایک ترتیب جاری و ساری ہوئی جو آج تک مسلمانوں میں مروج ہے تو اس سے اس بات کے ثبوت پر اور بھی زیادہ روشنی پڑتی ہے کہ وہی ترتیب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کی تھی جو حضرت عثمانؓ کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی۔ اصول میں تو حضرت ابن مسعود اور دوسرے صحابی رضی اللہ عنہم باہم متفق ہیں۔ اور جو اختلاف ہُوا وہ حضرت ابن مسعودؓ کے قیاس کی غلطی سے پیدا ہُوا۔ حضرت امام بخاریؒ نے ایک حدیث کو نقل کیا ہے جس میں ابن مسعودؓ نے سُورۃ بنی اسرائیل۔ الکھف۔ طٰہٰ۔ مریم اور انبیاء کو درمیان قرآن شریف میں ٹھیک اسی ترتیب سے بیان فرمایا جس ترتیب سے یہ سُورتیں اصل ترتیب قرآنی میں واقع ہیں۔ اِس قسم کی شہادتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرات ابن مسعود اور عثمان رضی اللہ عنہما کے نسخوں کی ترتیب ایک ہی تھی اور اگر فرض کے طور پر کسی اختلاف کو بھی مانا جائے تو وہ اختلاف نہایت ہی خفیف اور چھوٹا سا تھا۔ اور اسکی وجہ صرف حضرت ابن مسعودؓ کی غلط فہمی تھی۔

ابی بن کعب اور حضرت علی کی ترتیب مزعومہ

ترتیب سُور کے اختلاف میں ابن مسعودؓ کے علاوہ دو اور بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے یعنی ابی بن کعب اور حضرت علیؓ لیکن کوئی اعتبار کے قابل شہادت موجود نہیں جس سے اس امر کا ادنےٰ سا ثبوت بھی مل سکے کہ ابی بن کعب کسی مختلف ترتیب کے قابل اور عامل تھے۔ انکی نسبت یہ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ چوتھی سورۃ یعنی النساء کی جگہ آل عمران کو جو تیسری سورۃ ہے رکھتے تھے۔ اور تیسری کی جگہ چوتھی رکھتے تھے۔ اگر یہی اختلاف تھا تو یہ نہایت خفیف سی بات تھی۔ اور ممکن ہے کہ انہوں نے بھی ابن مسعودؓ کی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز میں پڑھتے سُن کر ایسا سمجھ لیا ہو لیکن ہم آگے چلکر ثابت کرینگے کہ حضرت اُبی بن کعب اِس اختلاف کے مُرتکب نہیں ہُوئے۔ اور اگر کبھی انہوں نے اس قسم کا اختلاف کیا بھی تھا تو واقعات پر مطلع ہوتے ہی وہ اس پر قائم نہ رہے اور اپنے ہی عمل سے ثابت کر دیا کہ ترتیب نبوی ہی ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی۔ ایسا ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآن شریف کو نزولی ترتیب کے موافق جمع کیا تھا۔ چنانچہ اسکی تائید میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں ان کا قول اس مضمون کا نقل کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اُس وقت تک آرام نہ کیا جب تک کہ سارے قرآن شریف کی سورتوں کو تاریخی یعنی نزولی ترتیب پر جمع نہ کر لیا لیکن یہ حدیث مجروح ہے کیونکہ باوجودیکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سریر خلافت پر بھی رونق افروز ہو گئے پر کوئی ایسا قرآن جس کا اس حدیث میں ذکر ہے نہ شائع ہُوا اور نہ آیندہ نسلوں کے ہاتھوں میں پہنچایا گیا اسکے علاوہ صحیح احادیث جن کا اعتبار بہرحال اس حدیث سے بہت زیادہ ہے ان سے اس واقعہ کی صحت کے خلاف ثبوت ملتا ہے۔ فتح الباری کے صفحہ۔ ا پر خود حضرت علی کی روایت سے ایک حدیث درج ہے عن عبد خیرۃ ال سمعت علیا یقول اعظم الناس فی المصاحف اجرا ابوبکر رحمۃ اللہ علی ابی بکر ھو اول من جمع کتاب اللہ۔ یعنی قرآن شریف کے جمع کرنیوالوں میں سب سے بڑے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا"۔ ایک طرف وہ حدیث جس میں یہ لکھا ہے کہ بعد وفات حضرت سرور کائنات صلعم حضرت علیؓ کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک انہوں نے قرآن جمع نہ کر لیا اور دوسری طرف یہ حدیث حضرت علی کی اپنی روایت سے اسکی تردید کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے رُو سے ابوبکر صدیق ہی ایک شخص تھے جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم کو جمع کیا۔ اور یہ حدیث اپنے ثبوت میں اکیلی نہیں بلکہ دوسرے تاریخی واقعات اسکے مؤید اور مُصدِّق ہیں۔ جن میں ایک بات تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی کسی دوسری ترتیب کا نہ ذکر ہی کیا اور نہ ہی موجودہ مسلمہ ترتیب سے مختلف ترتیب والا قرآن کسی کو دکھایا لیکن اس کے ماسوا بھی ایک اور الیسی زبردست بات ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو حضرت علی اور نہ حضرت ابی رضی اللہ عنہما اس ترتیب سے مخالف کسی دوسری ترتیب کے علمدار آمد رکھتے تھے جو حضرت عثمانؓ کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی تھی کیونکہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں بزرگوں کی سرپرستی میں قرآن کریم کی نقلوں کا کام بعہد خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سرانجام پایا تھا۔ اور اس وقت اُن کو اس کام میں حضرت عثمانؓ کے برابر دسترس حاصل تھی اور جس طرح انہوں نے ہم کو موجودہ قرآن مجید پہنچایا۔ اسی طرح اگر کوئی اور ترتیب اُن کے خیال میں ہوتی تو بجائے اسکے اسکو بآسانی ہم تک پہنچا سکتے تھے۔ اور کوئی مانع نہ تھا۔

سورۃ انفال اور توبہ کا تعلق

اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر نظر ڈالی جاوے جو قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب کے متعلق برعکس نتائج کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔ عن ابن عباس قال قلت لعثمان ما حملکم علی ان عمدتم الی الانفال وھی من المثانی الی براءۃ وھی من المئین فقرنتم بھما ولم تکتبوا بینھما سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم ووضعتموھما فی السبع الطوال فقال عثمان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثیرا ما ینزل علیہ السورۃ ذات العدد فاذا نزل علیہ الشئ یعنی منھا دعا بعض من یکتب فیقول ضعوا ھؤلاء الایات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکانت الانفال من اوائل ما نزل بالمدینۃ وبراءۃ من اخر القرآن وکان قصتھا شبیھۃ بھا فظننت انھا منھا فقبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبین لنا انھا منھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے کیوں سورۃ انفال کو سورۃ براءت کے ساتھ ایسے اتصال سے لکھا ہے کہ ان کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی ہی نہیں۔ اور اس طرح ان دونوں سورتوں کو سات لمبی سورتوں میں شامل کر دیا ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے جواب میں فرمایا۔ کہ آنحضرت صلعم کی عادت تھی کہ جب بہت سورتیں ان پر نازل ہوتیں اور ان میں کی کسی سورت کی آیت کا نزول ہوتا تو کسی کاتب وحی کو بلوا لیتے اور اس کو حکم دیتے کہ وہ آیت فلاں سورۃ کی فلاں موقعہ پر لکھ دے سورۃ انفال مدینہ میں ابتدائی زمانہ میں حضور صلعم پر نازل ہوئی تھی۔ اور براءت کا نزول آخری زمانہ میں ہوا تھا۔ اور ان دونوں کا مضمون باہم متوافق اور ملتا جلتا تھا۔ اسلئے میں نے یہ یقین کیا کہ دوسری سورۃ پہلی سورۃ میں سے ہی ہے۔ آنحضرت صلعم وفات پا گئے اور انہوں نے ہمیں واضح طور سے یہ نہ فرمایا تھا کہ یہ سورۃ اسی میں سے ہے"۔

بعض لوگ غلط فہمی سے اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ گویا جمع اور ترتیب قرآن حضرت عثمانؓ نے اپنے اجتہاد اور سمجھ کے موافق کی ہے! اور اسلئے اِس حدیث کو اس دعوے کی تائید میں بطور ثبوت پیش کرتے ہیں لیکن اس سے قطعاً یہ بات مستنبط نہیں ہوتی کہ حضرت عثمانؓ کی رائے کو ترتیب قرآنی میں کوئی دخل تھا۔ بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن شریف کی آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی نے کی ہوئی تھی اور اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ کی وہ کمال درجہ کی احتیاط ثابت ہوتی ہے کہ جس سے انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور عمل کو نہایت امانت کے ساتھ اس کام میں برتا۔ حالانکہ ساری سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کا عام طور پر قاعدہ تھا۔ مگر اس سورۃ کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کی سند رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نہ پاکر اپنی رائے کو اتنا بھی دخل نہ دیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی اس پر لکھ دیتے۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہے کہ اس میں ذکر کردہ واقعہ کے سوا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک لفظ اور ایک ایک سورۃ کے متعلق واضح طور سے حکم دیدیا ہوا تھا کہ اس کو فلاں موقعہ پر قرآن میں رکھا جائے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ربط و ضبط عبارت اور سیاق و سباق مضمون کے لحاظ سے قرآن شریف کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب فرمائی تھی۔ اور نوعیت مضمون میں ہم رنگی کے لحاظ سے ہی سورۃ انفال اور براءۃ کو ایکدوسرے سے ایسا متصل رکھا گیا تھا۔ درحقیقت اگر

سورۃ براءۃ کے معاملہ کو علیحدہ رکھ کر غور کیا جائے تو اس حدیث سے نہ صرف صاف طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ہر آیت کی نسبت کھلے طور پر حکم دیا تھا کہ اس کو کس موقعہ پر رکھا جائے۔ بلکہ آپ (صلعم) نے صحابہ کبار رضؓ کو ہر ایک سورۃ کا موقعہ اور ترتیب بھی کھلے طور سے بتا دیئے تھے۔ اور یہ بھی عیاں کر دیا کہ کونسی سورۃ کس سورۃ کے بعد لکھنی چاہیئے۔ اور آپ ہی نے ربط مضمون کے لحاظ سے سورتوں کی ترتیب کی تھی +

اب ہم اس حدیث کے اُس حصہ پر غور کرتے ہیں جو ان دونوں سورتوں کے متعلق ہے اور یہ دیکھتے ہیں۔ کہ کیا اِس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ان کی ترتیب کے متعلق مطلقاً کچھ نہیں فرمایا تھا؟ یہ امر ثابت ہے کہ سورۃ براۃ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایکسال پہلے نازل ہو چکی تھی۔ اسلئے یہ کہنا کہ آپ کو اس کا موقعہ بتانے کی مہلت نہ مل سکتی تھی غلط قرار پاتا ہے۔ اصل واقعہ یہی ہے کہ آنحضرت صلعم کی اپنی منشاء ہی ایسی تھی کہ ان دونوں سورتوں کو ایکدوسری کے ساتھ اِسی طرح متصل رکھا جاوے اور اُن کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو ہر سورۃ کے پہلے لکھی جاتی تھی نہ لکھی جائے۔ یہ دونوں سورتیں گو بظاہر الگ الگ رکھی گئی ہیں۔ اور دو مختلف ناموں سے موسوم ہیں لیکن ایک طرح سے دو حصے ایک ہی سورۃ کے ہیں۔ سورۃ براءۃ کی پہلی اسی آیات کا حج کے موقعہ پر جو لوگ جمع ہوتے تھے انمیں اعلان کیا گیا تھا اس طرح سے براءۃ ایک جدا سورۃ بھی ہو گئی۔ اسلئے آنحضرت صلعم نے کبھی کسی وقت کھولکر صحابہؓ سے نہیں فرمایا تھا کہ سورۃ براءۃ سورۃ انفال کا حصہ ہے۔ اور دوسری طرف کبھی اس پر بسم اللہ بھی نہیں پڑھی کیونکہ مضمون کے ہمرنگ ہونے کی وجہ سے گویا یہ اور سورۃ انفال ایک ہی سورۃ کے قائممقام تھیں۔ یہی واقعات تھے جن کو حضرت عثمانؓ نے تشریح کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا۔ اور یہ سمجھایا کہ جو کچھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکے متعلق فرمایا اور عمل کیا اسیطرح ہم عمل کرتے ہیں +

۵۔ مصاحفِ ابوبکر و عثمان

حضرت ابوبکرؓ نے جمع قرآن میں کیا کام کیا

اِس جگہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ہمنے آیندہ دینے کا وعدہ کیا تھا کہ اگر کُل قرآن کریم ضبط تحریر و حافظہ میں مع ترتیب سور و آیات کے آ چکا تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جیسا کہ صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے قرآن کریم کو جمع کرنیکی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کا کیا مطلب تھا۔ جاننا چاہیئے کہ اصل بات جیسا کہ معتبر روایات اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہی ہے کہ جمع قرآن کریم کا اصل کام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وحیٔ الٰہی کے ماتحت پُورا کیا۔ خود قرآن کریم اِس بات پر شاہد ہے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے جو پہلے بھی نقل کیجا چکی ہے۔ ان علینا جمعه وقرانه فاذا قرأناه فاتبع قرانه سورۃ قیامت کی آیت ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے کھلے طور پر یہ عہد موجود ہے کہ جیسا قرآن کریم کا پڑھنا یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑھانا ہمارا یعنی وحی الٰہی کا کام ہے۔ اسیطرح قرآن کریم کی جمع بھی ہمارا یعنی وحی الٰہی کا کام ہے۔ پھر ایکدوسرے موقعہ پر جب کفار نے یہ اعتراض کیا کہ قرآن شریف ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں نازل کیا گیا اور سارا اکٹھا نازل کیوں نہیں ہؤا اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب یُوں فرمایا۔ وقال الذين كفروا لولا نزل عليه القران جملة واحدة ج كذالك ج لنثبت به فؤادك ورتلنه ترتيلا۔ یعنی ٹکڑے ٹکڑے

کرکے نازل کرنے میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً وحی الٰہی کے نزول سے مورد وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسکین ملتی رہے (مگر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ان ٹکڑوں میں جوڑ کیونکر ہوگا۔ اور ان کی ترتیب کیا ہوگی کیونکہ) ان کو ترتیب اور تدریج سے پڑھنا یہ بھی ہمارا ہی کلام ہے غرضیکہ ایسی ایسی آیات اور ان واقعات سے جو ہم تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کرچکے ہیں نہایت صفائی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ جمع قرآن کا اصل کام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں خود ہی کیا تھا لیکن ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سوائے ان صحابہ کرامؓ کے جو کُل قرآن شریف کو حفظ رکھتے تھے دوسروں کو جمع کی ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کے حفظ رکھنے کی ضرورت پیش نہ آسکتی تھی پس قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پُوری ترتیب کے ساتھ جمع تو تھا لیکن یہ جمع شدہ قرآن کریم صرف حافظوں میں ہی محفوظ تھا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب یا ایک جلد کی صُورت میں قرآن شریف کو جمع نہ کیا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سُورۃ نزول کے وقت تحریر میں بھی فی الفور محفوظ کرلی جاتی تھی۔ مگر جب تک مہبط وحی علیہ الف الف صلوٰۃ وسلام موجود تھے اور وحی کا نزول جاری تھا۔ یہ سب تحریریں ایک جلد کی صُورت میں جمع نہ ہوسکتی تھیں وجہ اسکی یہ تھی کہ بعض سُورتیں جو ابتدائے مدنی زندگی میں نازل ہوئیں ان کی بعض آیات اخیر زمانہ نبوی تک نازل ہوتی رہیں۔ پس اگر سُورتوں اور آیات کو ترتیب دیکر ایک مجلد میں جمع کردیا جاتا تو یہ مشکل پیش آتی کہ ایک سُورۃ جو ساری لکھی جاچکی تھی اُس کی کوئی آیت جب بعد میں نازل ہوا اور بلحاظ ترتیب کے اس کا کسی سُورۃ کے درمیان میں آنا ضروری ہو تو اسے کیا کیا جائے۔ حافظہ میں تو ایسی ترتیب کا دینا ہر وقت ایک آسان امر تھا مگر تحریر میں جب درمیان کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی ہو جو قبل از وقت چھوڑی نہ جاسکتی تھی تو یہ دقت پیدا ہوتی کہ بعد کی نازل ہُوئی ہُوئی آیات جو ترتیب کے لحاظ سے کسی سُورۃ کے اندر آنی چاہئیں اپنے موقعہ پر رکھی جاسکتیں اسی مصلحت کے لحاظ سے آنحضرت صلعم نے اسی بات کو کافی سمجھا کہ جمع شدہ قرآن پوری ترتیب کے ساتھ حافظوں میں محفوظ رہے۔ مگر جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے۔ تو پھر قرآن شریف کے ایک کتاب کی صُورت میں جمع کرنے کی جو دقتیں تھیں وہ جاتی رہیں چنانچہ یہی ضرورت قرآن کریم کو ایک مجلد کی صُورت میں جمع کرنے کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں محسُوس کی گئی سلور اسی کو پُورا کرنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے زیدؓ کو جمع قرآن پر مامور کیا۔ تاکہ وہ تحریر اور ایک مجلد کی صورت میں اسی ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کو جمع کریں جس ترتیب کے ساتھ یہ پاک کتاب حافظوں میں جمع تھی +

زیدؓ کا جمع مسودات قرآن پر مامور ہونا

جو کچھ میں نے یہاں بیان کیا ہے اس کی تصدیق اس حدیث صحیح سے ہوتی ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں جمع قرآن کے واقعہ کی تفصیل ہے۔ یہ حدیث صحیح بُخاری کی ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کو ایک مہم بھیجنی پڑی۔ اس جنگ میں کئی قراء شہید ہوگئے جس پر حضرت عمرؓ کو خطرہ ہوا کہ اگر اور جنگیں ایسی ہی خطرناک پیش آجائیں تو ممکن ہے کہ سب کے سب قاری یعنی حافظ لوگ قتل ہوجائیں اور اس طرح سے قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع ہوجائے۔ حدیث اس طرح پر ہے۔ حدثنا موسیٰ بن اسمعیل عن ابراھیم ابن سعد حدثنا ابن شھاب عن عبید بن السباق ان زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قال ارسل

الی ابوبکر الصدیق مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عندہ قال ابوبکر رضی اللہ عنہ ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة لقراء القرآن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن وانی اری ان تامر بجمع القرآن قلت لعمر کیف تفعل شیئًا لم یفعله رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال هذا واللہ خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلك ورأیت فی ذلك الذی رأی عمر قال زید قال ابوبکر انك رجل شاب عاقل لا نتهمك وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القرآن فاجمعه فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی به من جمع القرآن قلت کیف تفعلون شیئًا لم یفعله رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال هو واللہ خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری للذی شرح له صدر ابی بکر وعمر رضی اللہ عنهما فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت اٰخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدها مع احد غیرہ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حتی خاتمة براءة فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاته ثم عند حفصة بنت عمر رضی اللہ عنہ۔ ترجمہ اس حدیث کا یہ ہے کہ زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ اہل یمامہ کے قتل کے بعد یعنی ان صحابہؓ کے جو جنگ یمامہ میں شہید ہوئے حضرت ابوبکر صدیق نے مجھے بُلا بھیجا۔ جب میں آپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ حضرت عمر بن خطاب بھی آپ کے پاس موجود ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ابھی حضرت عمر میرے پاس آئے اور مجھے کہا کہ یمامہ کے جنگ میں قرآن کریم کے قاریوں میں بہت قتل واقعہ ہوا ہے۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر اور میدانوں میں بھی اسی طرح قاری لوگ (یعنی حافظان قرآن کریم) قتل ہوتے رہے تو بہت سا حصہ قرآن شریف کا گم ہو جائیگا۔ اور میری یہ رائے ہے کہ آپ جمع قرآن کا حکم دیدیں۔ میں نے عمر کو کہا کہ تم کیونکر اس کام کو کرتے ہو جسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ عمر نے جوابدیا کہ خدا کی قسم اس میں بہتری ہے پس عمر میرے ساتھ مباحثہ کرتے رہے یہانتک کہ اللہ تعالٰے نے میرے سینہ کو اس کیلئے کھول دیا۔ اور میری بھی اس میں وہی رائے ہو گئی جو حضرت عمر کی رائے تھی۔ زید کہتے ہیں کہ پھر ابوبکر نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ تم عقلمند اور جوان آدمی ہو اور ہم تم پر کسی طرح کی تُہمت نہیں لگا سکتے۔ اور تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی لکھا کرتے تھے پس قرآن کو تلاش کر کے اس کو ایک جگہ جمع کرو۔ خدا کی قسم ہے اگر مجھے اس بات پر مجبور کرتے کہ تم ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کر دو تو یہ بات مجھے زیادہ دُشوار معلوم نہ ہوتی بہ نسبت اس کے کہ مجھے جمع قرآن کا حکم دیا۔ میں نے کہا تم کس طرح وہ کام کرتے ہو جسے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا واللہ یہی بہتر ہے۔ پس حضرت ابوبکر مجھے جواب دیتے رہے یہانتک کہ خدا نے میرا سینہ اِس بات کے لئے کھولدیا۔ جس کے لئے اس نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے سینے کھولے تھے۔ پس میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور میں اسے جمع کرتا تھا کھجور کی ٹہنیوں

اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں یعنی حافظوں سے یہانتک کہ آخیر سورۃ توبہ مجھے ابی خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا اور اور کسی کے پاس وہ مجھے نہیں ملا۔ یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم سے برأت کے خاتمہ تک پس یہ صحیفے حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھے یہانتک کہ خدائے تعالےٰ نے ان کو وفات دی پھر حضرت عمرؓ کی زندگی میں اُن کے پاس رہے اور اس کے بعد اُمّ المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس"۔

حدیث جمع سے چند نتائج

اس حدیث شریف سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں سب سے اوّل اس سے یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ کُل کا کُل قرآن شریف قراء یعنی ان لوگوں کے سینوں میں محفُوظ تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عین حیات اور آپ کے سامنے اسے حفظ کر چکے تھے حضرت عمرؓ نے جو اندیشہ ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ اگر قراء سب کے سب مارے جائیں تو قرآن کریم کے بہت سے حصے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر حافظان قرآن کریم کی زندگیاں خطرے میں نہوں تو قرآن شریف کے بھی ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں گویا حافظان قرآن کے سینوں میں بلا کم و کاست سارا قرآن شریف جمع تھا۔ دوسری بات جو اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جو جمع قرآن شریف کا کام کیا گیا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ حافظان قرآن کریم یعنی قراء کے قائمقام ایک اور امر پیدا ہو جائے یعنی قرآن کریم اس صُورت میں جمع ہو جائے کہ تمام قراء کے مارے جانے کی صُورت میں بھی اس کے کسی حرف یا لفظ کے تلف ہو جانے کا خطرہ باقی نہ رہے حضرت عمرؓ کس بات کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں؟ صرف یہی کہ جیسا یمامہ کے جنگ میں کئی قراء مارے گئے۔ اگر ایسے ہی خطرناک جنگ اور پیش آجائیں تو باقی حافظان قرآن کی زندگیاں بھی معرض خطر میں ہیں پس آپ نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن کریم حافظوں میں ہی جمع نہ رہے بلکہ ایسی جمع قرآن شریف کی کی جاوے جس کو بعض انسانوں کے مارے جانے سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرح سے یعنی حافظوں میں تو قرآن کریم سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کر دیا تھا۔ مگر حضرت عمر یہ چاہتے تھے کہ تحریر میں بھی قرآن شریف جمع ہو جائے تا قاریوں کے مارے جانے سے قرآن کریم کے کسی لفظ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ حدیث یہ نہیں کہتی کہ قرآن کریم اس وقت تک جمع نہ ہوا تھا بلکہ برخلاف اس کے اسکی شہادت کھُلے طور پر اس بات کو تو ثابت کرتی ہے کہ سینوں میں قرآن شریف بالکُل محفُوظ تھا پر اندیشہ ہُوا کہ اگر وہ سینے جن میں یہ پاک کلام محفوظ تھا وہی نہ رہیں یعنی حافظ لوگ سب کے سب جنگوں میں شہید ہو جاویں تو پھر کیا ہوگا۔ اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے تحریر میں اور ایک مجلد کی صُورت میں قرآن کریم کا جمع کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس حدیث سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حضرت عمرؓ کو قراء کے حافظوں میں پر اعتبار نہ تھا۔ حافظوں پر تو پُورا اعتبار تھا لیکن قراء کی زندگیاں خطرناک جنگوں کے پیش آجانے کی وجہ سے معرض خطر میں پڑ گئی تھیں تیسری بات جو اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک جب مجلد کی صُورت میں جمع قرآن کا کام شروع کیا گیا قرآن شریف کا کوئی حصّہ ضائع نہ ہُو چکا تھا حضرت عمرؓ صاف الفاظ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر باقی قراء بھی جنگوں میں شہید ہو جائیں اور دفعتہً کسی جنگ میں سب کا خاتمہ ہو جائے تو قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے حضرت عمر کا اندیشہ صرف آیندہ کے متعلق تھا۔ ان کے کسی لفظ سے یہ نہیں پایا جاتا کہ اس وقت بھی قرآن شریف کا کوئی حصّہ یا کوئی لفظ ضائع ہو چکا تھا بلکہ انکے الفاظ کا جن میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جو قراء

یعنی حافظان قرآن کریم اس وقت موجود ہیں۔ ان کے مارے جانے سے قرآن کریم کے کسی حصہ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے یہ صاف شہادت ملتی ہے کہ اس وقت تک کچھ ضائع نہوا تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ سارا قرآن شریف جمع ہو کر قراء یعنی حافظان قرآن کریم کے حافظوں میں پورے طور سے محفوظ تھا۔ اور یہ کہ حضرت عمرؓ اس جمع کے علاوہ جو سینوں میں محفوظ تھی ایک جمع قرآن کریم کی ایسی چاہتے تھے جو کتاب کی صورت میں ہو اور یہ کہ جب تحریری جمع کا کام شروع کیا گیا تو اس وقت تک حافظوں کے جمع شدہ قرآن شریف میں سے کوئی حرف یا کوئی لفظ ضائع نہ ہوا تھا۔ یہ تین نہایت ضروری باتیں ہیں جن کو یاد رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے حافظوں میں جمع کر کے محفوظ کر دیا تھا وہ بلا کسی تغیر و تبدل کے اور بغیر کسی حرف کے بڑھ جانے یا گھٹ جانے کے اسی ترتیب کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ حدیث جس سے یہ امور پایۂ ثبوت کو پہنچتے ہیں اول درجہ کی معتبر اور صحیح احادیث میں سے تسلیم کی گئی ہے +

جمع مسودات پر بحث

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا ان الفاظ سے کیف تفعل شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی جو کام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اسکو تم کیونکر کر سکتے ہو کیا منشاء تھا۔ یہ الفاظ حضرت ابوبکرؓ کے عمرؓ کی کسی تجویز کے متعلق تھے پس جو تجویز پیش کی گئی تھی اسی کے متعلق یہ جواب بھی ہونا چاہئے۔ اب یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی تجویز مطلق جمع قرآن کے متعلق نہ تھی بلکہ یہاں تک تو وہ مطمئن تھے کہ قرآن کریم حفاظ و قراء کے سینوں میں جمع ہے لیکن ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر حفاظ اور قراء ہی سب کے سب جنگوں میں شہید ہو جاویں تو ایسا نہو کہ قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے اسلئے انہوں نے قرآن کریم کے ایک جلد کی صورت میں جمع کرنے کی تجویز پیش کی تھی جو قراء کے نہ ہونے کی صورت میں بھی محفوظ کی محفوظ ہی ہو۔ دوسری طرف یہ امر بھی مسلم ہے کہ اگرچہ مکمل اور جمع شدہ قرآن شریف سورتوں اور آیتوں کی صحیح ترتیب کے ساتھ نہایت محفوظ طور پر حافظان قرآن کریم کے حافظوں میں موجود تھا۔ مگر جو تحریریں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے روبرو لکھوائی تھیں جیسا کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سورۃ کا لکھا جانا ثابت ہے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سب کی سب ایک جگہ جمع نہ کی گئی تھیں اور نہ ہی انکو کوئی ترتیب دیگئی تھی اور جیسا کہ ہمنے اوپر بیان کیا ہے مہبط وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں ان تحریروں کی جمع اور ترتیب ہو بھی نہ سکتی تھی کیونکہ حافظان قرآن کیلئے تو یہ ایک آسان امر تھا کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی اور ان کو بتا دیا جاتا کہ اسکو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد پڑھو تو وہ آسانی سے یہ کر سکتے تھے مگر ایک مکمل مجلد میں بعد میں ایسی آیتیں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔ اب جبکہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ قراء کی زندگیاں دشمنوں کے ہاتھ سے خطرہ میں ہیں تو آپ نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ سے یہ درخواست کی کہ وہ ان تحریروں کے جمع کرنے کا حکم دیں۔ یہ وہ کام تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کرایا تھا۔ اسلئے حضرت ابوبکرؓ نے پہلے یہی جواب دیا۔ کہ جس کام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اسکو تم کیونکر کر سکتے ہو اس جواب سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی ہے کہ آنحضرتؐ کے صحابہؓ وحی الٰہی کے متعلق بڑے درجہ کی احتیاط سے کام لیتے تھے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے درمیان خوب بحث ہوئی جیسا کہ فلم یزل عمر یراجعنی

سے ثابت ہے یعنی حضرت عمرؓ میری باتوں کا جواب دیتے رہے۔ اب اس حدیث شریف میں اس بحث کا کچھ تذکرہ نہیں کہ کیا سوال تھے اور کیا جواب تھے مگر آخر نتیجہ اس کا یہ لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کی بات بوجہ اسکے کہ وہ قوی تر وجوہ اور مضبوط تر دلائل پر مبنی تھی حضرت ابوبکرؓ نے بھی تسلیم کر لی۔ بلکہ جب زید رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح پہلے یہی جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو تو انہی دلائل سے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قائل کیا اور آخر انہیں بھی اسی کو تسلیم کرنا پڑا۔ قیاس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہوگا کہ اگر تحریری طور پر قرآن شریف کو جمع کرنے کا منشاء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نہ ہوتا تو آپ اس قدر احتیاط کیوں فرماتے کہ جبھی ایک آیت نازل ہوئی اسی وقت کاتبان وحی کو بلوا کر اسے لکھوایا! اور پھر یہ بھی بیان کیا ہوگا کہ تحریری جمع کرنے سے ہم کوئی نیا کام نہیں کرتے بلکہ جمع تو اصل میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کر چکے ہیں اور تمام و کمال ترتیب کے ساتھ اسے حفاظ کے سینوں میں محفوظ کر چکے ہیں۔ ہم نے صرف اسی جمع کا تتبع کر کے اصل تحریروں کو ایک مجلد کی صورت میں جمع کر دینا ہے۔ یہ چونکہ واقعات حقہ تھے اسلئے حضرت ابوبکر اور زید اور پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے انکو تسلیم کیا۔ غرض کہ نہ حضرت عمرؓ کی تجویز مطلق جمع کے متعلق تھی اور نہ ہی حضرت ابوبکرؓ کے جواب کا منشاء یہ تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قطعاً قرآن کو جمع ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہ تجویز اور جواب دونوں تحریری جمع کے متعلق تھے ؛

جمع مسودات کی مشکلات

اسی حدیث میں یہ الفاظ جو زید نے مشکلات کا خیال کر کے کہے کہ اگر مجھے ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے کیلئے کہا جاتا تو مجھے یہ قرآن کی تجویز کی نسبت زیادہ دشوار نہ معلوم ہوتا ان الفاظ کو بعض کوتہ اندیش اور کم فہم معترضین نے محل اعتراض بنایا ہے اور ان سے وہ یہ مطلب نکالنا چاہتے ہیں کہ گویا قرآن شریف اس وقت ایک ایسی پراگندہ صورت میں تھا کہ زید رضی اللہ عنہ اسکے جمع کرنے کو پہاڑ کے اٹھانے کی طرح ناممکن سمجھتے تھے۔ ایسی بین شہادتوں کے ہوتے ہوئے جن سے صفائی سے ثابت ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کی جماعت میں بہت سے حافظ قرآن کریم کے موجود تھے اور کل قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عین حیات میں جمع ہو چکا تھا ایسی دور از قیاس باتوں کو پیش کرنا حماقت اور تعصب کی انتہائی حد ہے۔ زید کو تو خود اسلئے بھی یہ تجویز دشوار معلوم ہو رہی تھی کہ ان کے ذہن میں ابھی تک یہ بات نہ آئی تھی کہ جب تحریروں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جمع نہیں کیا تو اور کوئی کیونکر کر سکتا ہے۔ چنانچہ ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ تم اس کام کو جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا کیونکر کر سکتے ہو۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیں کہ انہوں نے جمع قرآن کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر یہ الفاظ بولے تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس سے یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہلے قرآن شریف مطلقاً جمع ہی نہ ہوا تھا۔ تجویز حضرت عمر کی تحریروں کو جمع کرنے کی تھی اور یہ واقعی ایک بڑا مشکل اور بھاری کام تھا۔ چنانچہ اسکی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو ابن ابی داؤد نے مصاحف میں بیان کیا ہے۔ قال قام عمر فقال من کان تلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئا من القرآن فلیأت به وکانوا یکتبون ذلک فی الصحف والالواح والعسب قال وکان لا یقبل من احد شیئا حتی یشهد شاهدان۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور عام اعلان کیا کہ جس کو قرآن شریف کا کوئی ٹکڑا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پہنچا ہو وہ اسے لے آوے اور وہ یعنی صحابہؓ قرآن شریف

کاغذوں اور تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے پھر وہی راوی کہتا ہے کہ کسی سے کوئی چیز (یعنی لکھا ہوا قرآن کا ٹکڑا) قبول نہ کیا جاتا جب تک کہ دو گواہ گواہی نہ دیتے۔ فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۲۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے اور یہی شہادت حدیث زیر بحث سے بھی ملتی ہے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں جمع قرآن کا منشاء ان اصل تحریروں کو اکٹھا کرنے کا تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں لکھی گئی تھیں۔ پس یہی وہ مشکل تھی جس کو مدنظر رکھ کر زیدؓ نے اس کام کو اس قدر دشوار سمجھا۔ قرآن کریم کا بہت سا حصہ مکہ میں نازل ہو چکا تھا اور جو مدینہ میں نازل ہوا تھا وہ بھی سارا زید کے قبضہ میں نہ تھا کیونکہ زیدؓ کی غیر حاضری میں بعض وقت اور کاتب بھی لکھنے کیلئے بلائے جاتے تھے حضرت زیدؓ کو منتخب اسلئے کیا گیا کہ مدینہ میں جسقدر قرآن کریم نازل ہوا تھا اس کا اکثر حصہ زید نے ہی لکھا تھا۔ اور غالباً وہ سب مسودات انہی کے قبضہ میں تھے۔ مگر اس کام کو انجام دینا واقعی ایک بڑا دشوار امر تھا۔ تمام اصلی تحریروں کو جن جن کے قبضہ میں وہ تھیں وہاں سے تلاش کرنا تھا۔ اور پھر ان کو اس ترتیب کے ساتھ جو حافظان قرآن کے سینوں میں محفوظ تھی ترتیب دینا تھا۔ ہاں اس قدر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تحریروں میں سے ضائع کچھ نہ ہوا تھا بلکہ جس کسی کے پاس تھیں نہایت حفاظت سے رکھی ہوئی تھیں کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق صحابہؓ نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان تحریروں کو ضائع کر دیتے جن کو وہ اپنی جانوں سے بھی عزیز تر سمجھتے تھے بہرحال یہ ایک مشکل کام تھا اور ان تمام مشکلات کے پورے پورے احساس نے ہی زیدؓ کے منہ سے یہ الفاظ نکلوائے کہ یہ کام اُنکو ایک پہاڑ نظر آیا +

جمع ابوبکرؓ میں اصل مسودات کو جمع کیا گیا

اور بھی کئی باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیدؓ کے سپرد جو کام کیا گیا وہ ان اصلی تحریروں کو اکٹھا کرنا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں حضرت ابوبکرؓ اور عمر رضی اللہ عنہما کا یہ منشاء نہیں تھا کہ جس طرح حافظ لوگ قرآن شریف کو پڑھتے ہیں اس کے مطابق ایک نسخہ لکھوا لیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے پہلے یہ لفظ تھے جو زیدؓ کو فرمائے کہ قرآن کو تلاش کر کے اس کو اکٹھا کرو۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ تلاش کر کے منشاء تحریروں کو تلاش کرنا ہی ہو سکتا تھا۔ اگر منشاء صرف اسی قدر ہوتا کہ حافظوں کو جمع کر کے جس طرح وہ قرآن شریف پڑھیں اسی کے مطابق ایک نسخہ لکھ لیا جاوے تو حضرت ابوبکرؓ تلاش کرنے کا حکم نہ دیتے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اس وقت تک سارا قرآن شریف حافظوں کے سینوں میں محفوظ تھا اور کوئی حصہ اس کا ضائع نہ ہوا تھا۔ نہ ہی زیدؓ اس صورت میں کام کو اس قدر مشکل سمجھ سکتا تھا کہ وہ ان مشکلات کو ایک پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دیتا۔ ایسی صورت میں یہ کافی تھا کہ چند حافظوں کو جمع کر لیا جاتا اور جس طرح وہ لکھواتے جاتے اسی طرح حضرت زیدؓ لکھتے جاتے۔ اور اس طرح صحت کا پورا اہتمام ہو سکتا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ کا مدعا اصل تحریروں کو جمع کرنا تھا۔ جو آنحضرت کی ہدایت سے لکھی گئی تھیں تا اس طرح پر نہ صرف طرز تحریر ہی محفوظ ہو کر آئندہ نسلوں تک پہنچ جائے بلکہ اصل کی تصدیق بھی دوسرے طور پر ہو جاوے۔ اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زید نے اسی کے مطابق کارروائی شروع کی اور حضرت عمرؓ کے منشاء کو پورا کیا۔ کیونکہ جب ان کو معلوم ہو گیا۔ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما حق پر ہیں تو پھر وہ اپنی کارروائی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ پھر میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا میں اس کو جمع کرتا تھا کھجور کی ٹہنیوں اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں سے

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ دو کام کرتے تھے۔ اوّل وہ قرآن شریف کو تلاش کرتے تھے۔ اور پھر اسکو جمع کرتے تھے۔ اب جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے جمع کے مفہوم میں ترتیب ضروری پڑی ہوئی ہے مگر یہ ترتیب صرف ان تحریروں سے نہ ہو سکتی تھی جو متفرق طور پر کچھ کسی اور کچھ کسی کے قبضہ میں تھیں۔ لہذا ترتیب کے لئے اور جمع نبوی کی پیروی کرنے کے لئے ضروری ہوا۔ کہ جب تحریر ملجائے تو پھر اسکو ترتیب دینے کے لئے قراء یعنی حافظان قرآن کی طرف رجوع کیا جائے یہی مُراد حضرت زیدؓ کی "صدور الرجال" سے حدیث مذکور میں ہے کیونکہ بغیر اس جمع کی پیروی کے جو سینوں میں محفوظ ہو چکی تھی حضرت زیدؓ تحریری جمع کے کام کو پورا نہ کر سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے یہ زور دیا تھا کہ تحریری جمع کے کام کو جلدی شروع کیا جائے جبکہ ابھی بہت سے حافظان قرآن کریم زندہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ حضرت زیدؓ نے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے صدور الرجال کی طرف رجوع کیا۔ حدیث کے الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے بعض سورتوں کو تو قراء سے لے لیا اور بعض کے لئے تحریریں تلاش کیں۔ کیونکہ اگر حافظوں سے ہی قرآن کا اکٹھا کرنا ان کا منشاء ہوتا تو تحریروں کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی جب انہوں نے بعض سورتوں کو قراء پر اعتبار کرکے صدور الرجال سے لے لیا تھا تو باقی سورتوں کے لئے تحریریں تلاش کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اور اگر تحریروں کی تلاش کی ضرورت تھی تو پھر سب حصوں کے لئے یکساں تھی۔ اگر حافظہ پر ہی زید نے انحصار کرنا ہوتا تو کیا یہ کافی نہ تھا کہ چند قراء کو جمع کرتے۔ جو جیسا کہ حضرت عمرؓ کے بیان سے پایا جاتا ہے ابھی بہت سے زندہ موجود تھے اور قرآن کریم پوری طرح سے ان کے سینوں میں محفوظ تھا جس طرح وہ پڑھ کر سناتے جاتے اُسی طرح لکھتے جاتے تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ؛

جمع مسودات میں حضرت صلعم کی جمع کی پیروی کی گئی

اس جمع کے متعلق جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہوئی اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا یہ صحیفے اس جمع شدہ قرآن کریم سے مطابق تھے جیسا کہ اس وقت حافظوں اور قراء کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس طرح کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پڑھا جاتا تھا بالکل اس کے مطابق تھے یعنی آیا ان میں کسی قسم کی کمی یا بیشی یا ترتیب مضامین میں خلل تو نہیں ہوا۔ اس بات کے لیے وجوہ ہیں جن پر غور کرنے سے یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کمی بیشی ہوئی تھی۔ اول جو لوگ اس کام کی تکمیل چاہتے تھے اُن میں سے کسی کی غرض یہ نہ تھی کہ کسی قسم کا تغیر و تبدل اس میں ہو بلکہ وہ دل و جان سے اور پوری جستجو اور مستعدی سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح قرآن شریف کمال حفاظت کے ساتھ آیندہ نسلوں تک پہنچایا جائے بلکہ ان کے ایمان کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ کسی قسم کا نقص قرآن کریم کی حفاظت میں واقع ہو۔ دوم یہ جمع کا کام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف چھ ماہ بعد شروع ہو گیا تھا اور ابھی قریباً سب کے سب صحابہ زندہ موجود تھے جنہوں نے آنحضرت کے مُنہ سے قرآن شریف سُنا اور حفظ کیا تھا علاوہ حافظوں اور قراء کے دوسرے لوگ بھی جنہوں نے آنحضرت صلعم سے قرآن کو سُنا تھا اس قابل تھے کہ اگر کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر اس کلام پاک میں ہو تو وہ فوراً اس کو سمجھ جائیں پس ممکن نہ تھا کہ کوئی کمی بیشی یا تغیر ہوتا اور یہ بات خاموشی میں دب جاتی۔ سوم ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حدیث کے نقل کرنے میں بڑے درجہ کی احتیاط سے کام لیتے تھے پس ممکن نہ تھا کہ وہ وحی الٰہی میں کوئی کمی بیشی یا تغیر کرنے کی جرات کرتے جس قدر عظمت انکے دلوں میں کلام الٰہی کی تھی اس کے ساتھ افترا کا جمع ہونا یا عمداً کسی حصہ کو چھوڑ دینا ناممکن تھا۔ چہارم یہ بات بھی

ان میں ایسے تھے جو سارا قرآن شریف حفظ رکھتے تھے۔ اور ایک گروہ کثیر ایسا تھا جن کو بڑا حصّہ قرآن شریف کا یاد تھا۔ کسی کو کوئی حصہ اور کسی کو کوئی حصّہ اور جو کچھ کسی کو یاد تھا وہ اُسکی برابر تلاوت میں لگے رہتے تھے نمازوں میں بھی اور نمازوں سے باہر بھی۔ ایسے آدمیوں کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا کہ کوئی کمی بیشی یا تغیر واقع ہو سکتا۔ پانچم صحابہؓ کے درمیان قرآن کریم کے اجزا کے بہت سے نسخے مُروج تھے۔ اور یہ نسخے ابتدائے زمانہ سے ہی مروج تھے ہر ایک آیت یا حصّہ جب نازل ہوتا تو پہلے ایک تحریر آنحضرتؐ کے سامنے لکھی جاتی۔ پھر اسی سے صحابہؓ اپنے اپنے طور پر لکھ یا لکھوا لیتے۔ اب یہ نسخے متفرق طور پر کوئی کسی صحابی کے پاس اور کوئی کسی صحابی کے پاس موجود تھے۔ اور اس مجموعہ کی صحت کو پرکھنے کے لئے جو زیدرضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا کافی تعداد دوسری تحریروں کی موجود تھی ایسا ہی جو نسخہ ایک صحابی کے پاس تھا اس کا مقابلہ دوسرے سے ہو سکتا تھا۔ اور اس طرح پر زیدؓ کے مجموعہ میں کسی غلطی کے داخل ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایک طرف حافظہ کی زبردست شہادت اور دوسری طرف تحریر کی مضبوط گواہی ان دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود ہی بڑی بھاری گواہی تصدیق صحت کے لئے کافی تھی مگر دونوں نے ملکر وہ کام کیا جس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ ششم کسی روایت یا حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں جو جمع قرآن ہوئی اس میں کچھ نقص تھا یعنی کوئی حصہ داخل ہونے سے رہ گیا تھا یا کوئی ایسا حصّہ داخل ہو گیا تھا جو کلام الٰہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ خود میور کو اس بات کا اقرار ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "کوئی اجزا کوئی فقرے یا کوئی الفاظ ایسے نہیں سُنے گئے جو جمع کرنیوالوں نے چھوڑ دیئے ہوں نہ ہی کوئی ایسے پائے جاتے ہیں جو اس مسلم مجموعہ سے اختلاف رکھتے ہوں اگر ایسے کوئی اجزا یا فقرے یا الفاظ ہوتے تو ضرور تھا کہ ان کا تذکرہ ان احادیث میں پایا جاتا جنہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کی نسبت چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی محفوظ رکھی گئی ہیں"

حضرت عثمانؓ نے مجموعہ صحف حضرت ابوبکرؓ کی پیروی کی

پس اس بات کا یقین کرنے کیلئے کہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے جو مجموعہ صحف تیار ہوا تھا وہ کیا بلحاظ ترتیب اور کیا بلحاظ عبارت کے اس مجموعہ سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ سلم کی اپنی ہدایت سے تیار ہو کر صحابہؓ کے سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا پوری پوری مطابقت رکھتا تھا قوی ترین وجوہات موجود ہیں۔ اگر ایسی مطابقت ہوتی تو صحابہ کبھی اس مجموعہ کو جو زیدؓ نے تیار کیا تھا قبول نہ کرتے۔ یہ مجموعہ بعد تکمیل حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا اور آپ کی وفات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا پھر آپ کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس رہا اور حضرت عثمانؓ کے وقت میں انہیں کے پاس موجود تھا اس طرح پر یہ مجموعہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے حضرت عثمانؓ کے وقت تک پہنچگیا۔ یہ بھی اغلب ہے کہ اس نسخہ سے دوسرے لوگوں نے اپنے اپنے لئے نسخے لکھ لئے ہوں اور اس طرح پر اس کی کافی اشاعت بھی ہو گئی۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بعض امور ایسے پیدا ہوئے کہ امیر المومنین نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ اپنے اہتمام میں چند نسخے اسی اصل مجموعہ سے لکھوا کر شائع کئے جاویں اور ان نسخوں کی اشاعت کو جو اب تک بطور خود لوگوں نے لکھ رکھے تھے روک دیا جاوے۔ چنانچہ وہ حدیث جس میں ان واقعات کا تذکرہ ہے صحیح بخاری میں درج ہے اور حسب ذیل ہے۔

عن انس بن مالک ان حذیفۃ ابن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اہل الشام فی فتح ارمینیۃ و

اذربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراءة فقال حذیفة لعثمان یا امیر المؤمنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الكتاب اختلاف الیهود والنصارٰی فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیك فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید بن ثابت وعبداللہ بن الزبیر وسعید بن العاص وعبدالرحمٰن بن الحرث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القرشیین الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیٔ من القرآن فاكتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصة فارسل الی كل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواہ من القرآن فی كل صحیفة او مصحف ان یحرق۔ ترجمہ۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ ابن الیمان حضرت عثمان کے پاس آئے اور ان دنوں وہ فتح ارمینیہ میں اہل شام کے ساتھ اور اذربیجان میں اہل عراق کے ساتھ جنگ کرتے تھے وہاں ان لوگوں کی قرأۃ نے حذیفہ کو گھبرا دیا پس وہ حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ کہ اے امیر المومنین اس امت کی خبر لو قبل اس کے کہ وہ کتاب میں ایسا اختلاف کرنے لگیں جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کرتے ہیں اس پر حضرت عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحیفے (یعنی مجموعہ قرآن جو حضرت ابوبکر کے وقت میں تیار ہؤا تھا) ہمارے پاس بھیجدو ہم اس کی نقلیں مصحفوں میں کر لینگے۔ اور پھر اصل صحیفے آپ کو واپس بھیج دینگے۔ حفصہ نے ان صحیفوں کو حضرت عثمان کے پاس بھیجدیا اور حضرت عثمان نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حرث بن ہشام کو حکم دیا۔ پس ان لوگوں نے ان صحیفوں کو مصاحف میں نقل کیا۔ اور حضرت عثمان نے قریشی جماعت کو یہ بھی ہدایت فرمائی۔ کہ جب تم اور زید بن ثابت (جو مدنی تھے) کسی امر میں اختلاف کرو تو اس کو قریش کی زبان میں لکھ لو کیونکہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہؤا ہے۔ پس انہوں نے آپ کے احکام کی تعمیل کی۔ اور جب صحیفوں کو مصاحف میں نقل کر چکے تو عثمان رضؓ نے وہ صحیفے حفصہ کو واپس بھیجدیئے۔ اور ہر ایک طرف میں ایک مصحف ان میں کا جو لکھے گئے بھیجدیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہؤا ہو اسکو جلا دیا جاوے ؎

حضرت عثمان کو کیا ضرورت پیش آئی

اس حدیث سے ان حالات کا اندازہ لگ سکتا ہے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو اس حکم کے دینے پر مجبور کیا کہ تمام اوراق جن پر بطور خود بعض لوگوں نے قرآن شریف کُل یا اس کا کوئی جُزو لکھ لیا تھا جلا دیئے جاویں اور آئندہ کے لئے ان صحیفوں سے نقلیں لیجاویں جو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابتؓ کے مجموعہ سے نقل کرائے تھے حضرت عثمانؓ کی افواج کا ایک جرنیل جو ارمینیا اور اذربایجان میں جنگ کر رہی تھیں آپکے پاس آیا اور یہ بیان کیا کہ لوگوں میں اختلافِ قرأت ہو رہا ہے۔ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلافات کا ہونا ملک شام اور ارمینیا وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے اور ایسے مقامات پر جیسے مکہ اور مدینہ یا عرب کے اندر ایسے اختلافوں کی کوئی شکایت نہیں کی گئی۔ اب شام اور ارمینیا نئے نئے فتح شدہ ملک تھے اور ان ملکوں کے لوگ جن کی زبان عربی نہ تھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے

یہ اختلافات کس قسم کے تھے خود حذیفہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف قرات یعنی پڑھنے کی طرز میں اختلافات تھے پھر یہ بھی ان اختلافات کی نسبت بتایا گیا ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سے اختلاف نہ تھے۔ ہاں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر بروقت خبر نہ لیگئی تو یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے یہود اور نصاریٰ کے سے نہ ہو جاویں۔ کیونکہ اگر رفع اختلاف نہ کیا جاوے تو ضرور ہے کہ مرور زمانہ سے وہ اختلاف کچھ کا کچھ رنگ پکڑ لیں۔ واقعی کن کن الفاظ میں اور کیا کیا فرق تھا اس کا جواب دینا ایک مشکل امر ہے۔ مگر بعض دوسری احادیث اور روایات پر غور کرنے سے ان اختلافات کا کچھ پتہ لگتا ہے احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض الفاظ کو لغت قریش کے سوا دوسری لغتوں میں ادا کرنے کی اجازت دی تھی۔ اور اس وقت بھی بعض لوگوں کو جن کو اس اجازت کی خبر نہ تھی ایسے لوگوں کو دیکھ کر اور سن کر جو کسی لفظ کو دوسری لغت میں ادا کرتے تھے ابتلا پیش آیا تھا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ہشام کو پڑھتے سنکر ان کی گردن میں چادر ڈالکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے رو برو لیگئے کہ غلط پڑھتا ہے اور آنحضرت صلعم نے ہشام کے پڑھنے کو صحیح قرار دیا۔ اس اجازت کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب کثرت سے عرب اسلام میں داخل ہوئے تو ان میں بعض اقوام ایسی تھیں جن کی بولی اگرچہ عربی تھی مگر خالص محاورہ قریش کے بولنے پر وہ قادر نہ تھے۔ اور ابتدا سے ہی ان کو بعض الفاظ کے خاص طریقوں پر ادا کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ پس اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ اجازت دیگئی کہ وہ لوگ جن حروف کو زبان قریش میں ادا نہیں کر سکتے انہیں اپنے محاورہ میں ہی اور اپنی طرز پر ادا کر لیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مختلف حروف میں بعض الفاظ کو ادا کرنے کی اجازت ایک ضرورت پر مبنی تھی اور اس اجازت سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو بچپن سے بعض الفاظ کو خاص طرز پر ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور محاورہ قریش میں جس میں قرآن شریف نازل ہوا تھا ان کو ادا نہ کر سکتے تھے۔ مگر اب جبکہ اسلام کثرت سے عرب باہر پھیل گیا تو یہ ضرورت بھی ایک حد تک مفقود ہو گئی۔ کیونکہ جن لوگوں نے عربی زبان کو سیکھا تھا اور عربی ان کی اپنی مادری زبان نہ تھی ان کے لیئے یہ برابر تھا کہ ایک لفظ کو محاورہ قریش میں ادا کریں یا کسی دوسری قوم کے محاورہ میں۔ مگر بعض صحابہ جو ایسے مرکزوں میں قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے وہ اب تک قرآن شریف کو بعض دوسرے حروف پر پڑھاتے تھے اور محاورہ قریش میں ان کو ادا نہ کرتے تھے۔ یہ بھی قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے عمداً اور بلا وجہ بھی بعض قراتوں کو اختیار کر لیا تھا اور انہی کے مطابق نومسلموں کو بھی تعلیم دیتے تھے۔ کوفہ میں خصوصیت سے اس بات کا ہونا پایا جاتا ہے۔ اور اس جگہ کے اختلافات کو دیکھ کر حذیفہ حضرت عثمان رض کے پاس پہنچے تھے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حذیفہ نے ان لوگوں کو ملامت کی جو اس قسم کی تفرقہ اندازی کرتے تھے بعض کہتے تھے ہم ابن مسعود کی قرأت پڑھتے ہیں بعض کہتے تھے ہم ابی بن کعب کی قرات پڑھتے ہیں کوئی کہتا تھا میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے بلکہ یہانتک نوبت پہنچی تھی کہ بعض بعض کی انہی باتوں کی وجہ سے تکفیر کرنے لگے۔ کیونکہ وہ لوگ اسلام میں حدیث العہد ہونے کی وجہ سے اصلیت سے ناواقف تھے۔ حالانکہ اگر پڑھانیوالے احتیاط کرتے تو یہ سب لوگ اصل محاورہ قریش پر آسانی سے پڑھ سکتے تھے حضرت عمر رض کے وقت کا ایک واقعہ بھی

اس کی تائید کرتا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس خبر پہنچی کہ ابن مسعودؓ حتیٰ حین کی بجائے عتیٰ حین پڑھاتے ہیں اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود کے نام حکم جاری کیا کہ قرآن شریف کا اصل نزول لسان قریش میں ہی ہے۔ پس آپ ہذیل کی لغت میں لوگوں کو قرآن نہ پڑھائیے۔ کیونکہ ہذیل حتیٰ کے بجائے عتیٰ بولتے تھے۔ جیسا کہ کسی عربی لغت کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اب اگرچہ حتیٰ حین کو عتیٰ حین پڑھنے کی اجازت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے محاورہ ہذیل کے سبب سے دی مگر ان نومسلموں کو ہذیل کی لغت پر قائم کرنا بلا ضرورت اختلافات ڈالنا تھا۔ اسلیئے حضرت عمرؓ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو منع کیا دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۴۔ ومن ثم انکر عمر علی ابن مسعود قرائتہ عتی حین وکتب الیہ ان القرآن لم ینزل بلغۃ ھذیل فاقرئ الناس بلغۃ قریش ولا تقرئھم بلغۃ ھذیل پس ایک تو بلا ضرورت اختلاف قرات کو پھیلانا۔ اور پھر دوسری طرف ان نومسلموں کا ناواقفیت کی وجہ سے ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانا یہ ایسے امور تھے جنہوں نے حذیفہ اور عثمان رضی اللہ عنہما کے دلوں میں خطرہ پیدا کیا اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مختلف حروف کہ جن میں قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دیگئی تھی تحریر میں لایا جاوے بلکہ ایسے تمام نسخوں کو محو کرکے ایسے نسخے مناسب احتیاط سے لکھوا کر شائع کیئے جاویں جو قریش کے محاورہ کے مطابق لکھے گئے تھے۔ کیونکہ یہی وہ محاورہ تھا جس میں قرآن کریم نازل ہؤا اور دوسرے حروف میں پڑھنے کی اجازت بعد میں اور خاص ضرورتوں کے لیئے دی گئی تھی پس جب وہ ضرورتیں نہ رہیں تو اس اجازت کی بھی ضرورت نہ رہی +

حضرت عثمانؓ نے قرآن کو محاورہ قریش کے مطابق لکھوایا

اب جب ہیں ان اختلافوں کی جن کو دیکھ کر حذیفہ کو خطرہ پیدا ہؤا تھا اور جن کی اصلاح عثمان رضی اللہ عنہ کے مدنظر تھی کچھ حقیقت معلوم ہوگئی تو اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ حضرت عثمانؓ نے اس موقعہ پر قرآن شریف کی نقل کرنے میں کیا کیا خاص ہدایات دی تھیں۔ جہانتک ان کا تذکرہ حدیث شریف میں ہے وہ یہ لفظ ہیں کہ اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیئ من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فانہ نزل بلسانھم۔ یعنی جب تمہارا اور زید بن ثابت کا کچھ اختلاف ہو تو قریش کی زبان میں لکھو۔ کیونکہ قرآن شریف قریش کی زبان میں ہی نازل ہؤا ہے اور یہ بھی ساتھ ہی لکھا ہے کہ ففعلوا ذلک یعنی انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے آگے قدم نہیں رکھا جہاں حضرت عمرؓ نے رکھا تھا۔ کیونکہ جیسا انہوں نے ابن مسعود کو لکھا تھا کہ ہذیل کے محاورہ پر قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھاؤ بلکہ قریش کی زبان میں پڑھاؤ کیونکہ قریش کی زبان میں ہی نازل ہؤا ہے۔ اسیطرح حضرت عثمانؓ نے بھی اختلاف کے وقت لسان قریش کو ہی اختیار کیا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے وقت میں نئے مسلمانوں کی بہت کثرت کے سبب سے اختلافات حرف یا قرأت بھی بڑھ گئے بلکہ ان سے بعض بُرائیاں پیدا ہونے لگیں۔ اسلیئے حضرت عثمانؓ نے ان بُرائیوں کو سرے سے ہی اُڑا دیا۔ ایک اور حدیث میں جو وہ بھی بخاری کی ہے حدیث منقولہ کے "فی شیئ من القرآن" کی بجائے الفاظ "فی عربیۃ من عربیۃ القرآن" وارد ہوئے ہیں جن سے

ہماری بات کی تائید ہوتی ہے یعنی یہ کہ اختلافات احرف محاورہ کے ہی اختلافات تھے کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک طرح پر بولتا یا لکھتا تھا اور دوسرا دوسری طرح پر۔ اب حضرت زیدؓ جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں قرآن شریف کو جمع کیا تھا اور جواب بھی نسخے لکھنے پر متعین ہوئے تھے قریشی نہ تھے مگر ان کے ساتھ تین اصحاب اور قریشی تھے اسلئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً یہ ہدایت کی کہ بصورت اختلاف لسان قریش کے مطابق لکھیں۔ اس اختلاف کی ایک ہی مثال احادیث سے معلوم ہوتی ہے جس کو ترمذی نے اس حدیث کے ساتھ جو بخاری کی روایت سے پہلے اوپر نقل کی ہے ابن شہاب کی سند سے بیان کیا ہے۔ اسکے الفاظ یہ ہے۔ فاختلفوا یومئذٍ فی التابوت والتابوہ فقال القرشیون التابوت وقال زید التابوہ فرفع اختلافھم الی عثمان فقال اکتبوہ التابوت فانہ نزل بلسان قریش۔ ترجمہ۔ اس موقعہ پر زیدؓ اور قریشیوں کا اختلاف لفظ تابوت اور تابوہ کے متعلق ہوا قریش کہتے تھے کہ اس لفظ کو تابوت لکھنا چاہیئے اور زیدؓ کہتے تھے کہ تابوہ لکھنا چاہیئے۔ یہاں کا اختلاف بالآخر حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا آپ نے فرمایا کہ تابوت لکھو کیونکہ قرآن شریف زبان قریش میں ہی نازل ہوا ہے ایک اس سے نہ صرف یہی پتہ لگتا ہے کہ زیدؓ اور قریش میں اختلاف کی کیا حقیقت تھی بلکہ اس سے ان اختلافات کا اندازہ بھی لگتا ہے جن کا ذکر حذیفہ نے کیا تھا۔ جن اختلافوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دُور کرنا چاہتے تھے وہ زیادہ تر اسی قسم کے اختلاف تھے۔ یہ اختلاف ایک ضرورت کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے جائز ہو گئے تھے مگر اب غیر عربی اقوام کے کثرت سے اسلام میں داخل ہونے سے یہ ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اور اسلئے حضرت عثمان رضی نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کو دُور کر دیا جائے۔ اور جیسا کہ ہم آگے چلکر سبعۃ احرف کی بحث میں دکھاوینگے خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کبھی یہ اجازت نہ ہوئی تھی کہ ان اختلافات احرف کو تحریر میں لایا جائے یا قرآن شریف کے اندر لکھا جاوے۔ اسی قسم کے اختلافات کو دُور کرنے کی غرض سے حضرت عثمانؓ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ تمام نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھ لئے ہیں اور اسلئے ان میں کافی احتیاط نہیں ہوئی محو کر دئے جاویں۔ چنانچہ ایک روایت میں ان کے یہ الفاظ آئے ہیں۔ محوت ما عندی فامحوا ما عندکم جو میرے پاس تھا وہ میں نے محو کر دیا ہے پس جو تمہارے پاس ہے تم اسے محو کر دو۔

صحائف عثمانی صُحف ابوبکر کی محض نقل تھے

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حضرت عثمانؓ نے جو نسخے اس قدر احتیاط سے صُحف ابی بکر رضی اللہ عنہ سے نقل کرائے ان میں اور اس اصل میں کوئی فرق تھا؟ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ والے صُحف میں بغیر کسی تغیر تبدل اور بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ کمی زیادتی کے وہی قرآن شریف تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے صحابہؓ کو حفظ اور جمع کرایا تھا۔ پس اب اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ عثمانی صحیفے بعینہٖ صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ کی نقل تھے تو ہمارا ادعا ثابت ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک قرآن شریف میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوا نہ کوئی کمی زیادتی ہوئی۔ نہ اسکی ترتیب میں کچھ ادل بدل ہوا بلکہ تمام و کمال حفاظت کے ساتھ وہی قرآن کریم ہمارے ہاتھوں تک پہنچا ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پڑھایا اور حفظ کرایا تھا

اور جو آپ کے رُوبرو لکھ لیا گیا تھا۔ اِس سوال کو حل کرنے کیلئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئیے کہ حذیفہ کے بیان پر سب سے پہلی تجویز حضرت عثمانؓ کو اختلافات دُور کرنے کی کیا سُوجھی وہ تجویز یہی تھی کہ آپؓ نے معاً اُم المومنین حفصہؓ کے پاس آدمی بھیجا کہ صُحف ابی بکر ہمارے پاس بھیج دو ہم اُن سے نقلیں اُتروا کر واپس بھیج دینگے ۔ ایک غور کرنیوالی طبیعت اس سے فی الفور یہ سمجھ سکتی ہے ۔ کہ حضرت عثمان کیا کرنا چاہتے تھے! انہوں نے جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ صرف یہی تھا کہ حضرت ابوبکرؓ والے صحف کی نقلیں کرا کر مختلف اطراف میں بھیج دی جاویں۔ اب حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں جمع کا اہتمام زید کے سپُرد ہی تھا۔ اور اب بھی حضرت عثمانؓ نے زید کے سپُرد ہی یہ کام کیا جس سے اور بھی وضاحت سے اُن کا منشأ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وہ صحف ابی بکر سے کسی قسم کا اختلاف نہ کرنا چاہتے تھے ۔ ہاں اس موقعہ پر انہوں نے یہ کیا کہ زید کے ساتھ تین قریشی اور لگا دیئے بلکہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ بارہ آدمی اس کام پر متعین کیئے گئے تھے اور ہدایت فرمائی کہ جب زید اور قریشیوں میں اختلاف کسی لفظ کی طرز تحریر کے متعلق ہو تو قریشیوں کے محاورہ میں وہ لفظ لکھا جائے کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں ہی نازل ہوا تھا ۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زید اور قریشیوں میں واقعی اختلافات ہوئے بھی تھے بلکہ یہ ایک احتیاط تھی ۔ اگر کوئی اختلاف بھی ہوا تو وہ ایک لفظ سے زیادہ کا اختلاف نہ تھا جیسا کہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر صرف ایک ہی اختلاف لفظ تابوت کے لکھنے کے متعلق ہوا ۔ اور یہ اختلاف حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کیا گیا ۔ زید کہتے تھے کہ تابوہ لکھا جائے اور قریش کہتے تھے تابوت لکھا جاوے ۔ اس کے سوائے اور کسی اختلاف کا جو زید اور قریشیوں کے درمیان ہوا ہو کوئی تذکرہ کسی حدیث میں نہیں پایا جاتا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو صُحف حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں زید نے جمع کیئے تھے اور جو حضرت عثمانؓ نے اِس موقعہ پر حضرت حفصہ سے منگوائے انہیں کی نقل بعینہٖ حضرت عثمانؓ نے مصاحف میں کرائی ۔ اور اس نسخہ سے کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا حضرت عثمانؓ کے اپنے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے حضرت حفصہ کو جو پیغام انہوں نے بھیجا وہ یہ تھا ۔ ارسلی الینا بالصحف ننسخھا فی المصاحف ثم نردھا الیک ۔ آپ صحف کو ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ ہم اُسے اور صحیفوں میں لکھ لیں اور اصل پھر آپ کو واپس کر دینگے چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی چند صحیفے لکھوا کر اصل کو واپس کر دیا گیا ۔ اگر اس اصل میں اور ان نسخوں میں جو حضرت عثمانؓ نے لکھوائے کوئی اختلاف ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ بعد میں ظاہر نہ ہو جاتا اور اگر حضرت عثمان کی خلافت میں اس کے ظاہر ہونے میں کوئی دقت بھی تھی تو بہرحال حضرت علی کے وقت میں ایسا کوئی مانع نہ تھا ۔ اور اس وقت بھی یہ اصل نسخہ موجود تھا۔* اس وقت تو اسلام میں کئی فریق بھی ہو گئے تھے ۔ پس اگر ایک فریق اس کا خواہاں نہ بھی ہوتا تو دوسرا ضرور ایسے اختلافات کو ظاہر کر دیتا جن لوگوں نے حضرت عثمان کو قرآن شریف پڑھتے ہوئے شہید کر دیا تھا کیا ممکن تھا کہ اُنکے ہاتھ میں اگر کسی ایسے اختلاف کا آنا ممکن ہوتا تو وہ اسکو ظاہر کر کے خلیفہ کے خلاف الزام قائم نہ کرتے اور اس طرح پر لوگوں کی نظروں میں اپنے اس فعل کو جائز دکھانے کی کوشش نہ کرتے ۔ پس جس صورت میں ایک ذرہ بھر شہادت اِس امر کی کسی حدیث سے نہیں ملتی کہ صحف ابی بکر سے مصاحف عثمانؓ کا کچھ اختلاف تھا اور برخلاف اسکے صریح شہادت ملتی ہے ۔ کہ حضرت عثمان نے اسی اصل سے جو

* باقی تمام نسخوں کا جلا دینا اور صحف ابی بکر کا نہ جلانا بھی اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ مصاحف عثمانی اور صحف ابی بکر میں کوئی اختلاف نہ تھا ۔ منہ

حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں تیار ہوا تھا اور اسی کاتب کی معرفت جس نے حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں صُحف کو جمع کیا تھا چند نسخے لکھوائے تو یہ نتیجہ یقینی اور قطعی ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ والے مصاحف حرف بحرف نقل صحف ابی بکرؓ کی تھے۔ اور اصل میں اور ان نسخوں میں جو حضرت عثمان نے لکھوائے کسی قسم کا فرق نہ تھا +

حضرت عثمانؓ کی کارروائی پر صحابہ شامل تھے

اگر حضرت عثمانؓ کا یہ حکم کہ وہ تمام اوراق جن پر خود بخود لوگوں نے قرآن شریف لکھ لیا تھا جلا دیئے جاویں صحابہؓ کی نظر میں قابلِ اعتراض یا ناجائز ہوتا تو وہ کبھی اس کو گوارا نہ کرتے حضرت عثمان کی طاقت تو خود صحابہؓ سے تھی لیس اگر وہی مخالف ہوتے تو حضرت عثمانؓ قطعاً ایسی کارروائی کرنے کی جرات نہ کر سکتے تھے بلکہ ایسی صورت میں ساری اسلامی دُنیا ان کے برخلاف اُٹھ کھڑی ہوتی۔ مگر معتبر روایت سے ثابت ہے کہ انہوں نے نہ صرف آپ کی اس کارروائی پر کوئی اعتراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ اسکو پسند کیا۔ اور اس میں حضرت عثمانؓ کو مدد بھی دی۔ اوّل محرک اس کے حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے۔ جو کہ ارمینیا سے اسی غرض سے آئے تھے۔ اور جب حضرت عثمانؓ کے سامنے یہ امر پیش ہوا تو پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ لیا کہ اس مُعاملہ میں کیا کرنا چاہیئے چنانچہ ایک روایت جسے ابن داؤد نے بیان کیاہے اور جس کے اسناد کو صحیح مانا گیا ہے یُوں ہے قال قال علی لا تقولوا فی عثمان الا خیرا فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملأ منا قال ما تقولون فی ھذہ القرأۃ فقد بلغنی ان بعضھم یقول ان قرأتی خیر من قرأتك وھذا یکاد ان یکون کفرا قلنا فما تری قال اری ان نجمع الناس علی مصحف واحد فلا تکون فرقۃ واختلاف قلنا فنعم ما رایت۔ یعنی حضرت علیؓ نے کہا کہ عثمانؓ کے حق میں سوائے کلمہ خیر کے کچھ نہ کہو۔ کیونکہ مصاحف کے بارے میں جو انہوں نے کیا وہ ہمارے مشورہ سے ہی کیا۔ انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ تم اس قرأت میں کیا کہتے ہو کیونکہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے۔ اور قریب ہے کہ ایسا کلمہ کُفر کا ہو جائے ہم نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا میری رائے یہ ہے۔ کہ ہم لوگوں کو ایک مُصحف پر جمع کریں۔ تا کہ کوئی فرقہ اور اختلاف نہ رہے۔ ہم نے جواب دیا کہ آپ کی رائے بہت اچھی ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے مشورہ کے بعد یہ کام کیا۔ ایک روایت کے بموجب بارہ آدمی اس مجلس میں شامل تھے جس کی سپرد قرآن شریف کے کئی نسخے لکھوانے کا کام کیا گیا تھا۔ چنانچہ زید سعید۔ ابی۔ انس بن مالک عبداللہ بن عباس وغیرہم کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے بُخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار آدمی اس اہتمام پر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً یہ کام چار صحابہ کے سپرد کیا گیا اور بعد میں اس تعداد کو بڑھا دیا گیا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جتنے نسخے پہلے تیار کرانے کا خیال ہو بعد میں ان سے زیادہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہو عبداللہ بن مسعودؓ ہی ایک ایسے شخص تھے جو علم قرآن میں مشہور ہونے کے باوجود اس مجلس میں شامل نہیں ہوئے لیکن اُن کو اس وجہ سے باہر نہ رکھا گیا تھا کہ ان کے خلاف کسی کو کوئی ضد یا تعصب تھا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے بلکہ بہت دُور یعنی کوفہ میں رہتے تھے۔ اگر انکو بلوایا جاتا اور ان کا انتظار کیا جاتا تو کام میں بڑا التوا پڑتا اسلیئے کام کو جلدی کرنے کی خاطر ان کو شامل نہ کیا جا سکا۔ مگر جیسا کہ صحابہؓ کے مشورہ سے یہ کام شروع ہوا تھا۔

ایسا ہی اس کی تکمیل پر اور حضرت عثمانؓ کے اس حکم پر کہ باقی تمام اوراق کو جلا دیا جائے صحابہؓ نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ نے اوراق قرآن کریم کو جو خود بخود لوگوں نے نقل کر لئے تھے جلانے کا حکم دیا۔ تو میں بہت سے صحابیوں سے ملا مگر ان میں سے کسی نے حضرت عثمانؓ کے اس فعل پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اسے پسند ہی کیا۔ اصل میں جیسا کہ کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے حضرت عثمانؓ کو زیادہ تر فکر اختلاف قراءت سے نہیں ہوا بلکہ اس بات سے کہ جو لوگ اختلاف قراءت کی اصل وجہ سے ناواقف تھے انہوں نے ایسے اختلافات کو مباحثوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بنا لیا پس جب عثمانؓ اور دیگر صحابہ نے دیکھا کہ ایسے اختلافات فساد اور غلطیوں کا موجب ہو رہے ہیں اور جس ضرورت کیلئے ان کی اجازت دی گئی تھی وہ ضرورت باقی نہیں رہی تو انہوں نے مصلحت اسی بات میں سمجھی کہ ان اختلافات کا دروازہ آئندہ بند کر دیا جاوے۔

ابن مسعود کی عدم شمولیت

حضرت ابن مسعودؓ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس کام میں شریک نہ ہو سکے اور تمام جماعت صحابہؓ میں سے ایک وہی شخص تھے جنہوں نے بعض روایات کے مطابق حضرت زیدؓ کے متعلق نازیبا الفاظ بولے۔ اگرچہ یہ احادیث اعلیٰ طبقہ احادیث میں سے نہیں ہیں۔ مگر تاہم ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ابن مسعودؓ جیسے صحابی نے حضرت عثمانؓ سے اختلاف کیا۔ ایک روایت ان میں سے یہ ہے کہ ایک ایسے آدمی کو قرآن کے لکھنے پر مامور کیا گیا ہے جو ابھی ایک کافر باپ کی پیٹھ میں تھا جبکہ میں مسلمان ہو چکا تھا الفاظ اس روایت کے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے یہ ہیں۔ ان عبد اللہ بن مسعود کرہ لزید بن ثابت نسخ المصاحف وقال یا معشر المسلمین اعزل عن نسخ کتابۃ المصاحف ویتولاہا رجل واللہ لقد اسلمت وانہ لفی صلب رجل کافر۔ ان الفاظ سے مراد ابن مسعودؓ کی صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ عمر میں اور اسلام میں زید بن ثابت پر تقدم رکھتے تھے۔ اب یا تو یہ حدیث غلط ہے اور یا ابن مسعودؓ نے غلطی کھائی۔ اسلام میں تقدم یا عمر میں بڑے ہونا ایسے امور نہ تھے جو کتابت قرآن میں بھی فضیلت کو ثابت کر سکتے اور اسلئے ان الفاظ سے کچھ مطلب نہیں نکلتا۔ مگر جب کتابت کے معاملہ میں فضیلت کو دیکھا جاتا ہے۔ تو یہ یقیناً زید بن ثابت کو حاصل تھی۔ جب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور زید بن ثابت اسلام میں داخل ہوئے۔ کتابت وحی کا کام زیادہ تر انہی کے سپرد رہا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عین حیات ہی میں وہ کاتب الوحی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کتاب کی صورت میں قرآن شریف کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں کی نظر زید بن ثابت پر ہی پڑی حالانکہ ابن مسعودؓ بھی اس وقت وہیں موجود تھے اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ سے بڑھ کر کوئی شخص اس امر کو نہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ موزوں اس کام کے لئے کون ہے۔ اگر واقعی ابن مسعودؓ زیدؓ کو اس قابل نہ سمجھتے تھے تو یہ اعتراض تو انہیں حضرت ابوبکرؓ کے وقت کرنا چاہئے تھا جس وقت ایسا اہم کام جمع کا ان کے سپرد کیا گیا تھا مگر اس وقت انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ روایت ہی غلط ہے۔ اور یا ابن مسعودؓ نے غلطی کی۔ زید بن ثابت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اور تمام صحابہؓ کی نظر میں اس کام میں سب پر سبقت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں

حضرت عثمانؓ کے وقت میں اول تو کام ہی محض اس قدر تھا کہ ایک اصل نسخہ سے دوسرے نسخے نقل کیے جاویں اور دوم حضرت عثمان نے اس کام کو بھی بلا مشورہ نہیں کیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ من اکتب للناس تو انہوں نے جواب دیا کہ زید بن ثابت کاتب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اور اسی روایت کے اخیر میں ترمذی نے اسی راوی ابن شہاب سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں قال بلغنی انہ کرہ ذلک من مقالۃ عبداللہ بن مسعود رجال من افاضل الصحابۃ یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے ان الفاظ کو جو انہوں نے زید بن ثابت کے متعلق بولے اجل صحابہ نے ناپسند کیا اور برا منایا۔ علاوہ ازیں ان روایات کی رو سے اگر عبداللہ بن مسعودؓ کو کوئی بات ناپسند تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ زید بن ثابت کو اس کام پر کیوں مامور کیا گیا ہے اور مجھے مامور کیوں نہیں کیا گیا حضرت عثمان پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ بعض روایات جو بہت کمزور ہیں اس قسم کی بھی آئی ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنا نسخہ قرآن حضرت عثمان کے آدمیوں کو دینے سے انکار کیا اور کہ انہوں نے زبردستی ان سے چھین لیا۔ مگر ان روایات پر یقین کرنے کے کافی وجوہات موجود نہیں ہیں۔ اور اگر بفرض محال ان روایات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو ان سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حضرت عثمانؓ نے جو نسخے لکھوائے تھے۔ وہ ناقص تھے یا صحیح نہ تھے ان سے اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو صرف یہی کہ عبداللہ بن مسعود جو بعض قرائتیں اپنے طور پر پڑھتے تھے ان سے روکا جانے پر انہوں نے اظہار ناخوشی کیا۔ اور اسی وجہ پر اپنے نسخہ قرآن کو دینے سے انکار کیا۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں باقی صحابہؓ نے کس کی تائید کی؟ کیا ایک آدمی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جس نے ابن مسعودؓ کی رائے کی تائید کی ہو جس طرح ابن مسعود کھلے طور سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس اظہار کی وجہ سے کسی نے ان کو مارنہ ڈالا تھا اسی طرح دوسرے صحابہؓ بھی اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے تھے۔ اور کوئی ان کو روکنے والا نہ تھا۔ مگر سب صحابہؓ نے بالاتفاق حضرت عثمان کی کارروائی کو صحیح سمجھا اور ابن مسعود کی تائید نہیں کی +

ان تمام واقعات سے جو اوپر بیان ہوئے یہ امر نہایت صفائی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ جو مصاحف حضرت عثمانؓ نے شائع کرائے وہ لفظ بلفظ اور حرف بحرف اس قرآن کریم کی نقل تھے جو حضرت ابوبکرؓ نے جمع کرایا تھا جس کے متعلق ہم پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ بلا تفاوت ایک حرف کے وہی قرآن شریف تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو سکھایا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کرا کر بھیجے تو اس وقت ہزارہا صحابہؓ ابھی زندہ موجود تھے اور بعض ان میں سے جیسے عبداللہ بن عمر اور ابی بن کعب وغیرہما ایسے تھے جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عین حیات اور آپ کے سامنے کل قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور ہزارہا آدمی ایسے تھے جنہوں نے آپ کے بعد قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا۔ اب حضرت عثمان نے جو مصاحف لکھوائے اُن کا زمانہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف ۱۲ سال بعد ہے۔ اور اگر ان مصاحف میں اصل نسخہ سے یا قرآن شریف سے جیسا کہ حافظوں میں محفوظ تھا کچھ بھی اختلاف ہوتا تو ممکن نہ تھا۔ کہ صحابہؓ خاموشی سے ان مصاحف کو قبول کر لیتے۔ قرآن کریم ان کا سب سے بڑا قیمتی خزانہ تھا جسے وہ جانوں سے بھی عزیز رکھتے تھے۔ اور اگر ضرورت ہوتی تو پہلے اپنی جانوں کو قربان کر دیتے۔ مگر یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے

تھے کہ قرآن شریف میں کوئی شخص کسی قسم کا تغیر تبدیل کرے۔ ان میں صرف قرآن شریف کی اعلیٰ درجہ کی محبت اور اخلاص ہی موجود نہ تھا بلکہ ان کے ہاتھ میں ایسے ذرائع موجود تھے جن سے وہ مصاحف عثمانی کی صحت کو پرکھ سکتے تھے اگر کوئی فقرہ چھوڑ دیا جاتا یا کوئی حصہ جو قرآن میں داخل نہ تھا داخل کر دیا جاتا تو سینکڑوں صحابی اس کا تذکرہ کرتے مگر ابن مسعود تک نے بھی کبھی حضرت عثمان کے خلاف یہ الزام نہیں لگایا کہ آپنے کوئی حصہ قرآن شریف کا چھوڑ دیا ہے یا کچھ بڑھا دیا ہے بلکہ اس کی شکایت صرف یہ تھی کہ اسکو بعض قرأتوں کے پڑھنے سے کیوں روکا گیا +

اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن شریف میں کوئی تغیر نہیں کیا بلکہ جیسا آپ کو جمع ابوبکرؓ سے ملا وہی انہوں نے سب مسلمانوں تک پہنچایا۔ انہوں نے جو کارروائی کی وہ تمام صحابہؓ کے مشورہ سے تھی اور پھر نقلیں کرنے کا اہتمام ان صحابہؓ کے سپرد کیا گیا جو اپنی قرآن دانی میں سب سے بڑھ کر شہرت رکھتے تھے پھر جو نسخے آپنے لکھوا کر شائع کئے ان کو تمام اسلامی دنیا نے صحیح نسخے قرآن شریف کے تسلیم کیا۔ اور اگر بالفرض محال کوئی اختلاف نسخوں میں ہوتا بھی تو اس کا اثر قرآن کریم پر جیسا کہ وہ حافظوں میں محفوظ تھا کچھ نہ پڑ سکتا تھا حضرت عثمانؓ کے سخت ترین دشمن جنہوں نے نہایت بیرحمی سے آپ کو قتل کیا انھوں نے بھی یہ الزام آپ پر نہیں لگایا کہ آپنے قرآن شریف میں کوئی کمی بیشی کر دی ہے۔ اگرچہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اعتراض انہوں نے بنایا تھا کہ حضرت عثمان نے ان کاغذات کو کیوں جلوایا جن پر قرآن شریف لکھا ہوا تھا۔ مگر اس اعتراض کی بنا صرف ان کے اس خیال پر تھی کہ جس کاغذ پر خدا کا نام لکھا ہوا ہو اسے جلانا نہیں چاہئیے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت علی کی خلافت میں بھی کسی شخص نے ایک لفظ ایسا بیان نہیں کیا جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ اس میں حضرت عثمان نے کوئی تحریف کی تھی +

اخیری حصہ ہمارے دعوے کا کہ جو قرآن شریف آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بعینہٖ صحف عثمانی کی نقل ہے یہ ایسا دعوے ہے جس کو سخت سے سخت دشمنان اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے پس قرآن کریم کا تمام تر حفاظت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچنا الیقینی اور قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہے صحیفِ ابوبکرؓ میں وہ قرآن تمام وکمال محفوظ تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے اور حضرت عثمانؓ کے مصاحف میں پوری احتیاط سے صحف ابی بکر سے نقلیں کرائی گئیں اور پھر ان سے آج تک تمام اسلامی دنیا میں قرآن شریف شائع ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ اگر دو ایسے ملکوں سے جن میں بعد المشرقین ہے دو نسخے قرآن کے لے لو تو ان میں ایک زیر زبر یا ایک حرف یا لفظ کا فرق بھی نہ پاؤ گے۔ اگر حفاظت الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو اس قدر حفاظت انسانی طاقت میں نہ تھی۔ اب ہم ان چند اعتراضات کا جواب دینگے جو بعض حدیثوں کی بنا پر حفاظت قرآنی پر کیئے جاتے ہیں۔ اور اس مضمون سے اصل مضمون حفاظت قرآن کریم کا مکمل ہو جائیگا +

۶۔ اعتراضوں کے جواب

اگرچہ جس قدر شہادت پہلے پانچ عنوانوں کے نیچے دیجا چکی ہے وہ اسبات کے ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن کریم ہر ایک قسم

حفاظت قرآن پر چھ قسم کے اعتراض

کی تحریف اور تصرف سے محفوظ ہم تک پہنچا ہے اعلیٰ درجہ کی قطعی اور یقینی شہادت سے ہے اور کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا لیکن چونکہ اس سوال کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اس لئے ذیل میں ہم ان تمام اعتراضوں کو جو عیسائیوں نے قرآن کریم کے محفوظ ہونے پر کئے ہیں نقل کر کے ان کا جواب دیتے ہیں۔ تاکہ کسی مخالف کو یہ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے کہ فلاں اعتراض کا جواب نہیں دیا گیا۔ جہاں تک ہیں نے مخالفین کی تحریروں پر غور کیا ہے مندرجہ ذیل اعتراضات پر زور دیا گیا ہے +

(۱) یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ موجودہ قرآن شریف میں بعض فقرے ناقص اور ٹوٹے ہوئے ہیں اور کہ اصل میں وہ فقرے مکمل تھے پس ضرور ہے کہ بعض حصے ضائع ہو گئے ہوں +

(۲) ایک اور اعتراض یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی نے قرآن کے بعض نسخوں کو جو بعض صحابہ کے پاس تھے اور جن کی قرأتیں حضرت عثمان رض والے صحیفہ سے مختلف تھیں تلف کرا دیا یا اُن کی اشاعت کو روک دیا پس ان نسخوں کے تلف کرانے سے ضرور قرآن شریف کے کچھ حصے ضائع ہو گئے ہونگے +

(۳) ایک اعتراض یہ ہے کہ بعض حصوں کو ہمیشہ کے لئے قرآن شریف میں داخل کرنے کا منشاء آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نہ ہوگا یا نہ تھا یا بعض حصے منسوخ ہو گئے ہونگے اور ممکن ہے کہ زید نے اِن امور پر اطلاع نہ پانے کی وجہ سے اُن کو قرآن شریف میں داخل کر دیا ہو +

(۴) چوتھا اور بڑا بھاری اعتراض یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بعض عبارتیں قرآن شریف میں پڑھی جاتی تھیں جو اب نہیں پڑھی جاتیں جس سے موجودہ قرآن کریم کے ناقص ہونے کا نتیجہ نکالا جاتا ہے +

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے موجود ہیں (جس سے معترض کی مُراد فرقہ شیعہ ہے) جو اِس بات کو مانتے ہیں کہ قرآن شریف محفوظ نہیں رہا۔ بلکہ ناقص ہے اور اس میں سے بعض حصے نکال دیئے گئے ہیں +

(۶) تازہ ترین اعتراض ڈاکٹر منگانا نے اس صورت میں کیا ہے۔ کہ اسکو بعض اوراق قدیم نسخہ جات قرآنی کے ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے موجودہ نسخہ جات سے کسی لفظ یا حرف کا اختلاف پایا جاتا ہے +

بعض فقرات کے نامکمل ہونے کا اعتراض

مختلف مضامین کو پڑھ کر جو قرآن کریم کی جمع پر لکھے گئے ہیں ہم نے یہ چند اعتراض مختصر الفاظ میں بطور خلاصہ ان مضامین سے نکالے ہیں۔ اور ان میں تازہ سے تازہ تصانیف جو اسلام کے خلاف لکھی گئی ہیں شامل ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب کے ساتھ ان اعتراضوں کا ایک ایک کر کے جواب دینگے۔ اعتراض اوّل کا بڑا حامی ایک مضمون نویس ہے جس نے اسلام (محمڈنزم) پر انسکلو پیڈیا برٹینیکا میں مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون نویس لکھتا ہے کہ حضرت عثمان والے نسخے مکمل نہیں تھے۔ کیونکہ ان میں بعض فقرے ایسے پائے جاتے ہیں جو کھلے طور پر ناقص اور ادھورے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ ان عبارتوں کا کچھ حصہ جس سے ان کی تکمیل ہوتی تھی ضائع ہو گیا ہے۔ ایک طالب حق اور ایک سمجھدار انسان بڑی آسانی سے اِس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کی اس مضبوط اور قطعیۃ الدلالت

شہادت کے بالمقابل جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ایسا وہم کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا بلکہ اسکو دعوے بلا دلیل کی ذیل میں رکھ کر رد کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ قرآن شریف کا کوئی فقرہ ایک شخص کی نظر میں ادھورا دکھائی دیتا ہے اسلئے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اصل فقرہ ضرور کچھ اور ہوگا اور کچھ حصہ اس کا ضائع ہو گیا ہوگا۔ ہم تو تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرت صلے اللہ وسلم نے سکھایا وہ سب صحابہؓ نے حفظ کر لیا اور مردوں اور عورتوں نے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا اور اس کے جواب میں یہ وہم پیش کیا جاتا ہے۔ کہ چونکہ کسی صاحب کو کوئی فقرہ مکمل معلوم نہیں ہوتا اسلئے کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہوگا۔ معتبر تاریخی شہادت کے خلاف ایسے توہمات کو پیش کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ اب یہ بھی ثابت ہے۔ کہ جس وقت حضرت زیدؓ نے تحریری جمع کے کام کو شروع کیا تو آپؓ نے نہ صرف قرآن مجید کے حافظوں سے ہی مدد لی بلکہ ان تمام تحریروں کو بھی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی ہدایت سے لکھی گئی تھیں جہاں جہاں وہ تھیں وہاں سے جمع کیا۔ اور اس طرح پر ہر ایک آیت اور ہر ایک لفظ کے متعلق پوری پوری تحقیقات کر کے اسکو صحیفوں میں لکھا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض فقرے ادھورے ہیں۔ یہ خود مخالفین کی عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے جہاں کمال فصاحت و بلاغت کسی فقرہ میں پائی جاتی ہے اس کو بوجہ اپنی ناواقفیت کے وہ ادھورا کہہ دیتے ہیں۔ اور جہاں نہایت باریک اور گہرا تعلق آیات میں ہے وہ بوجہ ایک سطحی نظر سے اسکو دیکھنے کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان آیات میں کوئی ربط نہیں ہے۔ بھر ایسے ایسے توہمات کو جو ناواقفیت سے پیدا ہوتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تاریخی شہادت کے بالمقابل اعتراضوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے +

پھر گویا اسی بات کی تائید میں کہ بعض فقرے ناقص پائے جاتے ہیں یہی مضمون نولیس نسکلو سیڈیا میں لکھتا ہے کہ چند چھوٹے اور الگ الگ ٹکڑے ابتک ایسے پائے جاتے ہیں جو کہ اصل میں قرآن شریف کے حصے تھے مگر زیدؓ نے ان کو شامل نہیں کیا۔ اب ان احادیث پر مفصل بحث جو تھے نمبر کے اعتراض میں آئیگی یہاں میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اعتراض اول کے ساتھ اس کو بیان کرنے سے معترض کا منشاء یہ ظاہر کرنے کا ہے کہ جو فقرے ناقص پائے جاتے ہیں انہیں کے ٹکڑے ابتک حدیثوں میں موجود چلے آتے ہیں۔ اگر یہ ثابت کر دیا جاوے کہ بعض فقرے جن کو معترضین ادھورے سمجھتے ہیں وہ ان ٹکڑوں کے ساتھ شامل کرنے سے جو ایسی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں درحقیقت کامل ہو جاتے ہیں تو پھر یہ مضمون بھی قابل بحث ہو جاتا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اعتراضوں کی بنا۔ صرف توہمات پر ہے اور کوئی مثال پیش نہیں کیجاتی کہ مثلاً قرآن شریف کا فلاں فقرہ ناقص ہے اور فلاں حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ فلاں عبارت کسی وقت قرآن شریف کا جزو تھی اگر اس عبارت کو اس ناقص فقرہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو اُن کے ملنے سے ایک کامل فقرہ بن جاتا ہے۔ اگر ایسی کوئی مثال پیش کیجاوے تو پھر اعتراض کی صورت بھی بنتی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ ٹکڑے جو احادیث میں بیان کئے گئے ہیں ان کیلئے کوئی ایسی جگہ قرآن شریف کے اندر نہیں ملتی کہ جہاں ان کو رکھا جا سکے۔ اور اسی سے ان ٹکڑوں کی اصل حقیقت کا پتہ لگتا ہے +

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر ان تمام اعتراضوں پر یکجائی نظر سے غور کیا جائے تو وہ خود ہی ایکدوسرے کا ابطال کرتے ہیں بات یہ پیش کی جاتی ہے۔ کہ قرآن شریف کے بعض حصے گم ہو گئے اور اس کی تائید میں یہ واقعات پیش کئے جاتے

بحیثیت مجموعی اعتراضات ایکدوسرے کے مؤید نہیں بلکہ ایکدوسرے کی تردید کرتے ہیں

ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے سوائے ان صحیفوں کے جو اپنی نگرانی میں تیار کرائے تھے باقی تمام صحف قرآنی کو جلا دیا اور انکی نقلیں شائع نہ ہونے دیں اور کہ بعض احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بعض عبارتیں اصل میں قرآن شریف میں پائی جاتی تھیں جواب اس میں داخل نہیں ہیں اور کہ بعض فقرے موجودہ قرآن میں ناقص ہیں اور کہ شیعہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بعض حصے جن میں حضرت علیؓ کے فضائل کا ذکر تھا وہ قرآن سے نکال دیئے گئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے مصحف تیار کرا کے اطراف میں بھیجے اور دوسرے نسخوں کو جلانے کا حکم دیا تو اس کے بعد وہ اختلاف جو صحف عثمانی اور دیگر صحائف میں بتائے جاتے ہیں یا تو موجود رہے اور یا قطعاً نابود ہو گئے۔ اگر ایسے اختلافات صحف عثمانی کی اشاعت سے قطعاً زائل ہو گئے تھے تو پھر وہ احادیث جن میں یہ ذکر ہے کہ فلاں عبارت قرآن شریف میں داخل تھی بالکل غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اور اگر ایسے اختلاف بعد میں بھی کچھ نہ کچھ محفوظ چلے آئے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے نسخے قرآن کریم کے دنیا سے کیوں نابود ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کی سلطنت میں اگر یہ ممکن نہ تھا تو اسکے بعد کون روک سکنے والا تھا جن لوگوں نے ان اختلافات کو نسلاً بعد نسل محفوظ رکھا تھا کیوں کچھ وقت گذرنے کے بعد جب اسلام کی سلطنت متفرق ہو گئی انہوں نے ان کو اپنے نسخوں میں درج نہ کر لیا اور کون مانع ہوا۔ پھر ایک دوسری مشکل اس میں یہ پیش آتی ہے کہ اگر وہ حصص جن کو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان نے چھوڑ دیا تھا محفوظ رہے یا کل نہیں تو ان میں سے بعض ہی محفوظ رہے تو چاہیئے تھا کہ وہ یا تو اعتراض نمبر اول اور یا اعتراض نمبر پنجم کے مطابق ہوتے یعنی ان سے یا تو فرضی نقص بعض فقرات کا دور ہوتا یا حضرت علیؓ کی فضیلت ان میں پائی جاتی۔ مگر تعجب ہے کہ جو عبارتیں جن کا ذکر احادیث میں ہے نہ تو فرضی نقص کو پورا کرتی ہیں نہ ہی حضرت علیؓ کی فضیلت کی بو تک ان میں پائی جاتی ہے جو حصص بزعم معترضین گم ہوئے تھے ان کا تو نام و نشان تک نہیں ملتا اور جو حدیثوں میں عبارتیں پائی جاتی ہیں وہ گمشدہ حصص میں سے نہیں ہیں کیا عجیب بات نہیں اور اس سے ایک دانشمند آدمی ایک مفید نتیجہ پر نہیں پہنچتا؟ ایک چیز کے گم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تائید میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے وہ چیز یا اس کے کچھ اجزا برآمد ہو گئے ہیں مگر جب اس برآمد شدہ مال کو دیکھا جاتا ہے تو یہ قطعی اس مال کا کوئی حصہ ثابت نہیں ہوتا جس کے گم ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا پس اس دعوے کے بطلان پر یہی ایک دلیل کافی ہے۔ پھر کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ حضرت علیؓ کی فضیلت کے بعض حصص قرآنی حضرت عثمانؓ نے چھوڑ دیے اور حضرت علیؓ خود ہی حضرت عثمانؓ کے بعد خلیفہ ہوئے مگر وہ اپنی فضیلت کے حصص کو دوبارہ قرآن شریف میں درج نہ کر سکے پس یہ تمام اعتراض خود ہی ایکدوسرے کی بیخکنی کرنیوالے ہیں۔ مگر مزید اطمینان کے لئے ان میں سے ہر ایک اعتراض پر الگ الگ بحث کر کے بھی ہم انکا جھوٹا ہونا دکھائینگے +

ابی اور ابن مسعود کے مصاحف

اب ہم دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں۔ حضرت عثمان نے یہ حکم دیا کہ سوائے ان اصلی صحف کے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں تیار ہوئے تھے۔ اور ان صحفوں کے جو ان صحف سے خود حضرت عثمانؓ نے نقل کرائے تھے باقی نسخے قرآن شریف کے جلا دیئے جاویں۔ اب ان مصحفوں میں سے جو جلائے گئے یعنی جن کے جلانے کا حکم دیا گیا دو مصحف کو مصحف عثمانی کے بالمقابل معترضین خاص وقعت دیتے ہیں۔ یعنے حضرت ابن مسعود کا مصحف اور حضرت ابی بن کعب کا مصحف

ان مصحفوں اور عثمانی مصحفوں میں جو اختلاف بتایا جاتا ہے اس کے متعلق انسکلوپیڈیا برٹینیکا کے مضمون نویس کی رائے اِس قابل ہے۔ کہ اسے مخالفانہ نکتہ چینی کا بہترین وکیل سمجھا جائے۔ یہ وہی مضمون نویس ہے جس کے مضمون محمدؐ نزم کا میں پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ وہ لکھتا ہے "ساتھ ہی اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کی دوسری صورتیں نے الفور نابود نہیں ہو گئی تھیں۔ خصوصیت سے ہمیں ابی کے نسخہ کے متعلق کچھ اطلاع ملتی ہے۔ جو فہرست اس کی سورتوں کی دی گئی ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑیگا کہ ابی کے نسخہ میں وہی کچھ تھا جو ہمارے موجودہ قرآنوں میں ہے اِس سورتیں ماننا پڑتا ہے کہ ابی کے مصحف کی بنا بھی انہی اصل صحف پر ہوگی جو حضرت زیدؓ نے جمع کیئے تھے یہی بات ابنِ مسعود کے مصحف پر بھی صادق آتی ہے اور اس کی فہرست مضامین جو ہم تک پہنچی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لمبی سورتوں یعنی طوال کو پہلے رکھنے کے اصول پر ابنِ مسعودؓ نے زید سے بھی بڑھ کر عمل کیا ہے۔ اس کے مصحف میں پہلی سورۃ یعنی فاتحہ اور آخری سورتیں اور آخری دو چھوٹی سورتیں یعنی معوذتین نہیں لکھی گئیں۔ اس کے برخلاف ابی نے اپنے مصحف میں دو دعائیہ فقرے زیادہ لکھ رکھے تھے جن کو ہم (حضرت) محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے سمجھ سکتے ہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس قسم کے اختلاف ہوتے ہونگے کہ آیا ایسے دعائیہ جملے قرآن شریف کا جزو ہیں یا نہیں۔ ان دونوں مصحفوں کی بعض قرأتیں جو مصحف عثمانی کی قرأتوں سے مختلف ہیں محفوظ رہی ہیں اور ان کے پرانے اختلافات قرأت کی بھی ایک بڑی تعداد محفوظ ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ ان میں سے ایک کثیر حصہ قرأتوں کا ایسا ہے جو موجودہ قرأت سے بہت کم درجہ کا ہے۔ تاہم بعض قرأتیں ایسی بھی ہیں جو مروجہ قرأت کے ہم پلہ ہیں اور چند ایک ایسی ہیں جن کو موجودہ قرأت پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔"

مخالف کا اعتراف کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے

لیکن اِس مضمون نویس کی صحیح صحیح رائے ناظرین کے سامنے پیش کرنے کے لیئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ سے ایک اور فقرہ کا ترجمہ بھی ہدیہ ناظرین کیا جائے اِس فقرہ میں جو منقولہ بالا فقرہ کے ساتھ ملحق ہے اور جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے وہ دلائل دیئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل قرآن شریف وہی ہے جو عثمانی مصحفوں اور انکی نقلوں میں موجود ہے "صرف ایک ہی شخص ایسا معلوم ہوتا ہے جس نے واقعی طور پر حضرت عثمانؓ کے مصحفوں کے جاری ہونے کے وقت کچھ مخالفت کی اور یہ ابنِ مسعود تھا۔ وہ پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے سب سے پرانے رفیقوں میں سے تھا۔ اور بہت موقعوں پر اس نے آپ کی خدمات بھی کی تھیں لیکن اُس کے خیالات کا دائرہ وسیع نہ تھا۔ اگرچہ وہ اسلامی مذہبی علم کلام میں ایک بڑا رکن مانا جاتا ہے پر اس کی مخالفت کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اب جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس وقت بہت سے ایسے مسلمان زندہ موجود تھے جنھوں نے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے قرآن شریف سنا ہوا تھا اور پھر اس بات کو بھی دیکھتے ہیں کہ کمزور خلیفہ عثمان کی بعض دوسری تجاویز کی وجہ سے متعصب حامیان نے بڑی سخت مخالفت کی اور کہ ان لوگوں کا مخالفانہ جوش عثمان کے بعض حریص پرانے رفیقوں کے سبب سے اور بھی تیز ہو گیا یہانتک کہ آخرکار انہوں نے خلیفہ کو قتل کردیا۔ اور بالآخر اس بات پر غور کرتے ہیں کہ خلیفہ کی موت کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں انہیں مختلف فریق اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ کوئی ایسے وجوہ ان کے ہاتھ میں آجائیں جن سے وہ اپنے

مخالفین پر کفر کا فتویٰ لگا سکیں۔ جب ہم ان تمام باتوں پر غور کرتے ہیں تو ان سے صاف طور پر مصحف عثمانی کے اصل قرآن ہونے کا نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ کسی فریق نے یہانتک کہ حضرت علیؓ کے فریق نے بھی اس معاملہ میں حضرت عثمانؓ پر اعتراض نہیں کیا۔ اور نہ اس مصحف کو چھوڑا جو زید نے تیار کیا تھا جو حضرت عثمانؓ اور ان کے خاندان کا مخلص وفادار تھا"+

مجنون معترضین

میں نے یہ فقرے اس غرض سے نقل کئے ہیں تاکہ ناظرین خود اعتراض کی وقعت کو دیکھ سکیں اور معلوم کر سکیں کہ مخالفین اگر سوچ سمجھ کر چلیں تو موجودہ قرآن کے اصل قرآن ہونے پر کہانتک اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس مضمون نویس کی رائے مخالف نکتہ چینی کو سنجیدگی سے بیان کرتی ہے۔ اور اسلیئے اِسکی تردید سے ان تمام اعتراضوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے جو معترضین نے کیئے ہیں میرے خیال میں کیا انگریزی اور کیا اُردو تحریروں کو جہانتک پڑھا جائے اس سے زیادہ وقعت اعتراض کوئی معلوم نہیں ہوتا لیکن اس بات کا ظاہر کرنا بھی ضروری ہے کہ اسلام پر بعض دیسی عیسائی صاحبان نے مجنونانہ اعتراض بھی کیئے ہیں ایسی ایک تحریر کی مثال مصنف تاویل القرآن میں ملتی ہے۔ یہ شخص اپنی تاریخ قرآن کو ان الفاظ سے شروع کرتا ہے "میری زندگی کے برسوں کے دن تھوڑے رہے اور برے"۔ اور پھر تشریح دعوے کرتا ہوا لکھتا ہے۔ "کہ اس امر کا کہ قرآن شریف کا کوئی بڑا حصہ ساقط ہو گیا اور جو بچ گیا وہ بدنظمی سے مرتب ہوا اکثر محققین کو اعتراف کرنا پڑا"۔ اور پھر اخیر پر لکھتا ہے "کہ جو قرآن اب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ اصل قرآن کا ایک ایڈیشن ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ بہتر اور معتبر ایڈیشن بھی موجود تھے جیسے نسخہ ابوبکرؓ یا نسخہ عبداللہ بن مسعودؓ یا نسخہ ابی بن کعبؓ یا نسخہ علیؓ یا ان سب کے علاوہ کوئی اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اہتمام سے جو نسخہ قرآن تیار ہوا تھا وہ حضرت عثمانؓ کے نسخہ سے ضرور افضل تھا۔ گو ابن مسعودؓ یا اُبی بن کعبؓ یا حضرت علیؓ کے قرآنوں کی ٹکر کا نہ تھا۔ ہم بھی ان سب مصاحف قرآن کی نسبت جو حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں شہید ہو گئے یہی کہتے ہیں کہ اگر آج وہ یا اُن کے نقول بھی ہم تک پہنچتے تو ان سب سے بہت بڑا ذخیرہ علم دین کا حاصل ہوتا ایسا کہ جس کے مقابل صحیفۂ عثمانی دریا کے مقابل گڑھا متصور ہوتا"۔ اور پھر ایک دوسری جگہ یہی شخص یوں ٹرّ ہانکتا ہے۔ "یہ بالکل مبالغہ نہیں کہ جو بدنظمی و بے احتیاطی قرآن کے حق میں ابتداء سرزد ہوئی۔ دنیا میں کسی کتاب کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو وہ صحیفہ قرآن جو حضرت عثمانؓ نے جمع کرایا ہم تک بے کم و کاست پہنچا۔ مگر وہ قرآن جو آنحضرت چھوڑ گئے گم ہو گیا۔ اور یہ جو باقی ہے صرف اسکی یادگار ہے کچھ نے ترتیب حصص جو اپنی قسمت سے بچ رہے"۔ اور پھر ایک جگہ سبعۃ احرف کی بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔ "پس ہم کو یہ ماننا پڑا کہ وہ قرآن جو حضرت پر نازل ہوا وہ ہفتگانہ قرآن تھا۔ اور لفظ قرآن کا اطلاق حقیقت میں ان ساتوں حروف کے مجموعہ پر ہوتا تھا۔ اور اب جو قرآن موجود ہے یعنی صحیفۂ عثمانی وہ زیادہ سے زیادہ صرف کسی ایک حرف پر مشتمل ہے۔ اور اسلئے اگر بہت رعایت کریں تو اسکو صرف ایک ساتواں حصہ سالم قرآن اصلی کا کہہ سکتے ہیں"۔ ایسے شخص کا جواب صرف یہی کافی ہے کہ وہ معترضین جن کی مخالفت کی حالت اس مصنف کی طرح جنون کی حد تک نہیں پہنچ گئی وہ خود اس کے ان تمام لایعنی دعووں اور مجنونانہ بڑوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اور یہ

گواہی دیتے ہیں جیسا کہ میور نے اور انسکلوپیڈیا برٹینیکا کے مضمون نویس نے دی ہے۔ کہ جس حفاظت سے قرآن کریم ہم تک پہنچا ہے اُس کی نظیر دُنیا میں نہیں ملتی اور کہ تمام واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل قرآن وہی ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور جو مصحف عثمانی کی نقل ہے۔ اور کہ مصحف عثمانی ہی اصل قرآن تھا اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر تبدل نہیں ہوا +

مصحف ابی اور ابن مسعود کی مصحف عثمانی سے مطابقت

اب ہم اصل اعتراض کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ابن مسعودؓ اور اُبی بن کعبؓ کے مصحف ملحاظ ترتیب اور ملحاظ عبارتوں کے عام طور پر مصحف عثمانی کے مطابق ہی تھے۔ اور یہ مطابقت یہاں تک تھی کہ راقم مضمون اِس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ ابن مسعودؓ اور ابیؓ نے اپنے مصحف ان صحف کی بنا پر تیار کئے جو زیدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں جمع کئے تھے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی جمع ہو چکا تھا اور اسی بنا پر ابن مسعودؓ یا ابی بن کعبؓ یا زیدؓ کے مجموعے تیار ہوئے تھے یہی وجہ اُن کی مطابقت کی تھی کیونکہ وہ سب ایک ہی سر چشمہ سے لئے گئے تھے۔ ہاں فرق صرف اس قدر تھا کہ حضرت زیدؓ نے جو صحف میں قرآن شریف کو جمع کیا تو اس میں صد درجہ کی احتیاط سے کام لیا گیا اور تمام اصل تحریریں اکٹھی کی گئیں۔ اور تمام صحابہ کے اتفاق اور مشورہ سے یہ جمع وقوع میں آئی۔ لیکن ابن مسعودؓ اور اُبی بن کعبؓ کی کوششیں صرف ذاتی تھیں۔ اسلئے اُن کا کسی موقع پر غلطی کھا جانا بھی ممکن تھا۔ بہرحال جو اختلاف ان مصحفوں کے مصحف عثمانیؓ سے بتائے جاتے ہیں وہ صرف دو قسم کے ہیں یعنی اوّل یہ کہ ابن مسعودؓ کے مصحف میں معوذتین اور فاتحہ قرآن کریم کے اندر نہ لکھی گئی تھیں اور ابیؓ کے مصحف میں دو دُعائیہ فقرے زائد لکھے ہوئے تھے۔ اور دوم کچھ قراتوں کا اختلاف تھا۔ لہذا ہم ان دو اختلافوں کی حقیقت پر غور کرونگا۔ اور تاویل القرآن کے مصنف کے بے سروپا اور لایعنی دعوے اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کی طرف توجہ بھی کیجاوے اور خود اس کے ہم مذہبوں کی تحریریں اس کے مجنونانہ دعووں پر نفریں بھیجتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے مصحف صرف صحف ابی بکرؓ کی نقل تھے۔ اور نقل کرنیوالے بھی خود وہی حضرت زیدؓ تھے جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے وقت صحف کو جمع کیا تھا۔ اور حضرت علیؓ کے مصحف کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی واقعات کے سامنے باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر حضرت علیؓ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا تو کیوں کبھی اسکی اشاعت نہ ہوئی۔ بالفرض اگر حضرت عثمانؓ مانع ہوئے تھے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے وقت میں کون مانع ہوا تھا۔ اور کم از کم یہ تو ضرور تھا کہ اگر اور کبھی موقع اسکی اشاعت کا نہ ملا تھا تو حضرت علیؓ اپنی خلافت میں ہی اسکو شائع کرتے اور دُنیا میں پھیلاتے۔ اور عجیب تر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں مصحف نقل کرانے میں خود حضرت علیؓ بھی مددگار ہوئے اور اپنے مصحف کا نام تک نہ لیا +

حدیث کے چار طبقے اور بارہ تصانیف جلال الدین سیوطی

ہمارے سامنے اب اس اعتراض کے متعلق یہ سوالات حل طلب ہیں۔ کیا ابیؓ اور ابن مسعودؓ کے پاس اپنے اپنے مصحف الگ تھے۔ کیا ان کا مصحف عثمانی سے کوئی اختلاف تعداد سور اور قراتوں میں تھا اور اگر تھا تو کس قدر۔ پہلے ابیؓ کو لو۔ کوئی معتبر حدیث ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ اُبیؓ کا مصحف الگ تھا جس کا مروجہ

قرآن سے اختلاف تھا یا یہ کہ اس مصحف میں علاوہ قرآن شریف کی ایک سو چودہ سُورتوں کے دو دُعائیہ جملے اخیر پر زائد لکھے ہوئے تھے۔ ہاں بعض احادیث جلال الدین سیُوطی کی اتقان میں ملتی ہیں۔ اور اسلئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ سیوطی کی احادیث پر ہم کہاں تک اعتبار کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے میں ناظرین کو شاہ عبدالعزیز دہلوی کے عجالہ نافعہ کا حوالہ دیتا ہوں جو اصُول علم حدیث پر ایک مختصر سا مگر نہایت قیمتی رسالہ ہے۔ شاہ صاحب نے احادیث کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اوّل میں جو سب سے زیادہ معتبر ہے وہ مُوطّا امام مالک اور بخاری اور مُسلم کو رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں ابوداؤد ترمذی اور نسائی کو رکھا ہے۔ اور ان کو بلحاظ اعتبار کے طبقہ اوّل سے کم درجہ کی تسلیم کیا گیا ہے تیسرے طبقہ میں ایسی کتابیں رکھی گئی ہیں جن کی عام طور پر قبولیت نہیں ہُوئی۔ اور نہ ایسی احادیث کو محض ان کتابوں میں ذکر کیا جانے کی وجہ سے قابل سند مانا گیا ہے بلکہ ان میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن کے راویوں کے ثقہ ہونے پر اور ان کی راستگوئی پر بڑی جرح ہوئی ہے۔ اس طبقہ میں احادیث کی ایسی کتابیں جیسے طبرانی۔ طحاوی۔ بیہقی۔ مستدرک حاکم۔ مسند ابن ماجہ۔ مسند دارمی اور اور چند کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے آخری طبقہ احادیث کا چوتھا طبقہ ہے جس کے متعلق شاہ صاحب یوُں لکھتے ہیں۔ طبقہ رابعہ احادیثے کہ نام ونشان انہا در قرون سابقہ معلوم نبود و متاخران انہا را روایت کردہ اند پس حال انہا از دو شق خالی نیست یا سلف تفحص کردند وانہارا اصلی نیافتہ اند تا مشغول بروایت انہا مے شدند یا یافتند و انہا قدحے و علتے دیدند کہ باعث شد ہمہ انہا را بر ترک روایت انہا و علی کل تقدیر ایں احادیث قابل اعتماد نیستند و مایہ تصانیف شیخ جلال الدین سیوطی در رسائل و نوادر خود ہمیں کتابہا است یعنی چوتھے طبقہ کی حدیثیں وہ ہیں جن کا پہلے زمانوں میں کہیں نام ونشان بھی نہیں پایا جاتا اور متاخرین نے ہی انکو روایت کیا ہے پس ایسی حدیثیں دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو پہلے لوگوں نے خوب تحقیق کی اور ان حدیثوں کو اصلی نہ پایا اسلیئے ان کی روایت نہ کی یا اگر انہوں نے ان کو پایا تو ان میں ایسی جرح اور علت دیکھی کہ سب کے سب ان روایتوں کو چھوڑ دیا دونوں صورتوں میں یہ احادیث قابل اعتبار نہیں ہیں۔ اور شیخ جلال الدین سیُوطی کی تصنیفوں کی کُل پونجی اپنے رسالوں اور نوادر میں اسی قسم کی کتابیں ہیں +

ابی کے اختلافات

پس اوّل تو اسی سے قیاس کر لینا چاہیئے کہ اتقان کی حدیثوں پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہ حدیثیں محققین کے نزدیک بالکل نا قابل اعتبار ہیں اور یا تو محض وضعی ہیں یا ایسی کمزور اور نا قابل اعتبار کہ کسی محدث نے اُن کی روایت کو نہیں لیا۔ اب ایک اور امر قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ کہ نہ صرف ان احادیث کو اعلے طبقہ کی احادیث سے کچھ تائید نہیں ملتی بلکہ تردید ہوتی ہے۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابی بن کعب بھی اس مجلس میں تھے جس کے سپرد حضرت عثمانؓ نے مصحفوں کا نقل کرانا کیا تھا۔ بعض اور احادیث ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں بھی ابی بن کعب نے جمع قرآن کے کام میں مدد دی لیکن اگر بفرض محال اس بات کو بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابی کے پاس ایک الگ مصحف بھی تھا جس میں انہوں نے علاوہ قرآن شریف کی سُورتوں کے دو دُعائیہ جملے بھی لکھے ہوئے تھے تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ وہ دُعائیہ جُملے فی الواقع جُزو قرآن شریف تھے

بلکہ اس سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کہ ابی بن کعبؓ ان کو قرآن شریف کی دو سورتیں سمجھتے تھے۔ اور اگر ابی کا خیال بھی ہو تو بھی اس سے قرآن کریم پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔ ہزار ہا صحابہؓ کی متفقہ شہادت ایک طرف اور ابی کا خیال ایک طرف؟ قبل اس کے کہ اُبی کے اِس خیال کو مصحف عثمانی پر حملہ کرنے کیلئے پیش کیا جاوے ان صحابہؓ کا نام تو معترضین کو لینا چاہیئے جنہوں نے اُبی کے اس خیال کی تائید کی۔ ابن مسعودؓ جن کے خیالات بعض امور کی نسبت اجماع صحابہؓ سے الگ تھے۔ وہ بھی ابی کی تائید نہیں کرتے اور ان دو جملوں کو قرآن کریم کا جزو قرار نہیں دیتے۔ اب اگر ایک شخص تحقیق کر کے اعتراض کرتا تو اسے تو یہ لازم تھا کہ پہلے وہ شہادت کا وزن کرتا اور پھر دیکھتا کہ آیا اعتراض کی صُورت بھی بنتی ہے؟ قرآن کریم کوئی ایک یا دو شخصوں کی جائداد تو تھی نہیں کہ جو کچھ وہ کہدیں وہی صحیح تسلیم کر لیا جائے اور یہ خیال کر لیا جائے کہ باقی صحابہ کو کوئی علم ہی نہ تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ صرف ایک اُبی کو یہ معلوم ہو کہ فلاں دو دعائیہ جُملے قرآن شریف کا جُزو ہیں اور باقی ہزار ہا صحابی اس سے بالکل بیخبر رہتے اور ان کے کانوں تک یہ بات ہی کبھی نہ پہنچتی۔ قرآن کریم کی ہر ایک آیت اس کے نزول کے وقت دشمنوں اور دوستوں کے درمیان کثرت سے شائع ہو جاتی تھی۔ اب ایک شخص سے غلطی بھی ہو سکتی تھی جس کی اصلاح ہزار ہا دوسرے شخصوں کی شہادت سے ہو سکتی تھی۔ بلکہ یہ ایک خصوصیت قرآن کریم کو حاصل ہے۔ کہ اسکی ہر ایک آیت ہزار ہا لوگوں کے سینوں میں فی الفور محفوظ ہو جاتی تھی اور اس طرح پر قرآن شریف کا محافظ کوئی فرد واحد نہ تھا۔ بلکہ ہزارہا محافظ تھے۔ اور ایک آدمی کی غلطی کی اصلاح دوسروں کی شہادت سے فی الفور ہو سکتی تھی۔ پس تمام صحابہ کی مُتفقہ شہادت ہی ایک ایسا امر ہے جو غلطی کرنے سے بچا سکتا ہے اب اگر مُصحف عثمانؓ اور مُصحف ابی میں کوئی اختلاف تھا تو اس کی صورت یہ نہ تھی کہ حضرت عثمان ایک بات کہتے ہوں اور ابی اس کے خلاف کوئی دوسری بات کہتے ہوں۔ بلکہ یہ اختلاف ابی کا تمام جماعت صحابہؓ سے تھا حتّٰی کہ ابن مسعود سے بھی اختلاف تھا۔ پس ایسی صورت میں کسی معترض کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہدے کہ ممکن ہے کہ حق ابی کے ساتھ ہو یعنی ابی کی بات سچّی ہو۔ کیونکہ ابی کی رائے اکیلی تھی اور اس کے خلاف تمام صحابہ کی مُتفقہ شہادت تھی۔ پس جبکہ یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ایک آیت نازل ہونے کے وقت عام طور پر شائع ہو جاتی تھی۔ اور دوسری طرف ابی کے خیال کا مؤیّد صحابہ میں سے ایک بھی نہیں ملتا۔ بلکہ وہ کھلے طور پر ابی کی بات کو غلط قرار دیتے ہیں تو یہ ماننا پڑیگا کہ ابی غلطی پر تھا کیونکہ یہ تو قرین قیاس ہے کہ ایک شخص سے غلطی ہو جائے اور دوسرے اس کی اصلاح کر دیں مگر یہ ممکن نہیں کہ قرآن شریف کا کوئی حصّہ نازل ہو اور اس کا علم سوائے ابی کے اور ایک صحابی کو بھی نہ ہو۔ یہ سب باتیں اس روایت کو جو اتقان میں موجود ہے قابل اعتبار فرض کر کے لکھی گئی ہیں۔ اور دراصل جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں یہ روایت ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے +

حفد اور خلع

اب ہم ایک اور پہلو سے اسی معاملہ پر نظر کرتے ہیں۔ اتقان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو جُملے جن کو حفد اور خلع کی سورتوں کے نام سے نامزد کیا گیا ہے دُعائے قنوت کے دو حصّے ہیں۔ اور اس طرح پر ہیں فقرہ اوّل اللّٰھم انا نستعینک ونستغفرک ونثنی علیک الخیر ونخلع ونترک من یفجرک۔ فقرہ دوم۔ اللّٰھم

ایاک نعبد و لک نصلی و نسجد و الیک نسعی و نحفد و نرجو رحمتک و نخشی عذابک ان عذابک بالکفار ملحق ۔ ترجمہ فقرہ اول کا یہ ہے۔ اے اللہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور تیری ہی حفاظت طلب کرتے ہیں اور تیری نیک ثنا کرتے ہیں اور جو شخص تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے بیزاری ظاہر کرتے اور اسے چھوڑتے ہیں۔ اور دوسرے فقرے کا ترجمہ یہ ہے۔ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تیرے لیئے ہی نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں اور تیری طرف ہی بھاگ کر آتے ہیں اور تیری ہی خدمت کرتے ہیں اور تیری رحمت کی امید کرتے ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ تیرا عذاب کافروں کو جا لگتا ہے ۔

دعائے قنوت قرآن کا حصہ نہیں

یہ وہی دعائے قنوت ہے جس کو مسلمان نماز میں پڑھتے ہیں اور یہ دعا خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے دعائے قنوت کی اور بھی بعض صورتیں صحیح احادیث میں آئی ہیں اور مندرجہ ذیل دعا بہت مشہور ہے۔ اللھم اھدنی فیمن ھدیت و عافنی فیمن عافیت و تولنی فیمن تولیت و بارک لی فیما اعطیت و قنی شر ما قضیت فانک تقضی و لا یقضی علیک انہ لا یذل من والیت ولا یعز من عادیت تبارکت ربنا و تعالیت مشکوۃ باب الوتر۔ اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دعائے قنوت کی یہ مختلف صورتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں مروی ہیں اور قرآن کریم سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے مسلمانوں میں سے کیا سابقین اور کیا متاخرین سب دعائے قنوت کو پڑھتے رہے ہیں جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا ان کو سکھائی تھی۔ پس صحابہ کے علم کی حد صرف اسی بات تک نہ تھی کہ دعائیہ جملے جن کو ابی بموجب روایت اتقان اپنے مصحف میں شامل کرتے تھے ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی قرآن کا حصہ بتا کر نہیں سکھایا تھا بلکہ ان کو یہ بھی علم تھا کہ یہ دعائیہ جملے ان کو سکھائے بھی گئے ہیں۔ مگر ان کو جزو قرآن قرار نہیں دیا گیا۔ اس طرح پر صحابہ کی شہادت برخلاف ابی کے صرف لاعلمی کی شہادت ہی نہ تھی کہ وہ کہتے ہمیں کبھی یہ جملے سکھائے ہی نہیں گئے بلکہ ان کی شہادت یہ تھی کہ یہ جملے تو ہمیں سکھائے گئے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ قرآن کا جزو نہیں اسی لیئے صحابہ میں سے کسی نے ابی کی بات کی تائید نہیں کی۔ بلکہ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس دعاء القنوت کو پڑھا اور اپنے صحابہ کو بھی سکھایا۔ مگر کبھی اس کو جزو قرآن نہیں کہا۔ ممکن ہے کہ ابی کو صرف اس بات سے غلطی لگی ہو کہ یہ جملے نماز میں پڑھے جاتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اور بھی بہت سارے دعائیہ جملے نماز میں پڑھے جاتے تھے جو جزو قرآن نہیں تھے۔ اور یہ جملے بھی قرآن شریف کی آیات کی طرح فاتحہ کے بعد نہ پڑھے جاتے تھے اور نہ کبھی ایسا ان کو کافی سمجھا گیا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آیات قرآنی پڑھنے کی بجائے انہی دو جملوں کو پڑھ لیا جائے پس اگر ابی نے ان دعائیہ جملوں کو مصحف میں لکھا یا قرآن کریم کا حصہ سمجھا تو یہ محض ان کا خیال تھا اور غلط خیال تھا اور ہزارہا صحابہ کی قطعی شہادت اسکے خلاف بتاتی ہے کہ یہ جملے جزو قرآن ہرگز نہیں تھے۔ کیونکہ اول تو حضرت ابوبکر کے وقت جمع قرآن میں کل صحابہ اس کام میں شامل تھے۔ اور وہ جمع کسی ایک آدھ آدمی کی رائے سے نہیں ہوئی۔ پھر جب حضرت عثمان نے اسی قرآن کریم سے

نئے نسخے لکھوائے تو اس وقت بھی نقل کے اہتمام میں بہت سے صحابہؓ شامل تھے علاوہ ازیں کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں پائی جاتی کہ یہ قرآن شریف کا جزو ہیں اور مصحف عثمانی میں یہ نقص رہ گیا ہے کہ ان کو داخل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگر ابی کا کوئی اختلاف تھا تو انہوں نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ انہی نقلوں کے اہتمام میں شامل ہو کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ کیونکہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہو کہ یہ فقرے بھی مصحف کے اندر لکھنے چاہئیں۔ اور موجب ایسی ہی روایات کے آخر اپنا مصحف جلا کر حضرت عثمانؓ کے مصحف کی صحت کو قبول کیا۔ میں نہیں سمجھتا اس سے بڑھ کر اور واضح تر شہادت قرآن کریم کی صحت کی کیا ہو سکتی ہے +

ابن مسعود کا اختلاف

اختلاف قرأت کے سوال کو میں بالفعل چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ یہ مضمون لمبا ہے۔ اور الگ عنوان کے نیچے اس پر آگے بحث آتی ہے۔ اب ہم ان اختلافات پر بحث کرتے ہیں جو ابن مسعود کی طرف منسوب کئے گئے ہیں یعنی یہ کہ وہ معوذتین کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے۔ اس کے متعلق بخاری میں حسب ذیل حدیث کتاب تفسیر میں آئی ہے عن زر قال سالت ابی بن کعب قلت ابا المنذر ان اخاك ابن مسعود یقول کذا و کذا۔ فقال ابی سالت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقال لی قیل لی فقلت قال نحن نقول کما قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اور اسی کی دوسری روایت یوں ہے۔ عن زر بن حبیش قال سالت ابی بن کعب عن المعوذتین فقال سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال قیل لی فقلت فنحن نقول کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس حدیث کے الفاظ میں کچھ ابہام ہے۔ ترجمہ اس کا یوں ہے کہ زر کہتے ہیں میں نے ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ ابن مسعودؓ معوذتین کے بارہ میں ایسا ایسا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے ایسا ہی کہا گیا ہے سو میں نے بتا دیا۔ انہوں نے کہا پس ہم وہی کہتے ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ابن مسعودؓ معوذتین کے بارہ میں کیا کہتے تھے۔ آیا واقعی اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے اور اگر نہ لکھتے تھے تو کس وجہ پر۔ کیونکہ ممکن ہے وہ اسے کلام الٰہی سمجھتے ہوں مگر یہ کہتے ہوں کہ ان کا لکھنا قرآن شریف میں ثابت نہیں یا اور کچھ کہتے ہوں بہرحال حدیث کے الفاظ میں تصریح نہیں۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب ابی بن کعبؓ نے یہ دیا کہ انہوں نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے معوذتین کے متعلق دریافت کیا تھا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا جواب کیا تھا۔ اسی سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ ابی ان سورتوں کو قرآن شریف کا جزو سمجھتے اور مصحف میں لکھتے تھے۔ لیکن یہی جواب ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملا تھا۔ ظاہر الفاظ حدیث کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے یہ دونوں سورتیں اسی طرح وحی کی گئی ہیں۔ پس میں نے اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ مگر بعض دوسری احادیث سے جو کم پایہ کی ہیں یعنی بلحاظ اعتبار کے وہ اس قابل نہیں کہ ہم ان کی صحت پر وثوق کر سکیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود اپنے مصحف میں ان سورتوں کو لکھتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک روایت احمد کی ہے۔ ان عبد اللہ بن مسعود کان لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ اور ایک اور روایت ان الفاظ میں ہے

كان عبد الله بن مسعود يحك المعوذتين عن مصاحفه ويقول انهما ليستا من كتاب الله۔ یعنی عبد اللہ بن مسعودؓ معوذتین کو اپنے مصاحف سے کھرچ ڈالتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں*۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کا یہ خیال بعد کا تھا کیونکہ وہ لکھے ہوئے کو کھرچتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ یہ فعل ان کا کسی علم کی بنا پر نہ تھا بلکہ اجتہاد کی بنا پر تھا بہر حال کسی دوسرے صحابی نے ان کے اس فعل کی تائید نہیں کی۔ جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ قال البزار ولم يتابع ابن مسعود على ذلك احد من الصحابة وقد صح عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قرأهما في الصلوة۔ بزار کہتے ہیں کہ ایک بھی صحابی نے ابن مسعودؓ کی اس بات میں پیروی نہیں کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ نے معوذتین کو نماز میں پڑھا صرف اسقدر نہیں کہ دوسرے صحابہؓ نے ابن مسعودؓ کی بات کی تائید نہیں کی بلکہ خود ابی نے بھی اُن کی مخالفت کی اور اپنے علم کی بنا پر یہ فرمایا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو جزو قرآن ہی بتایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دو ہی آدمی ایسے بتائے جاتے ہیں جن کے مصاحف میں کسی اختلاف کا ذکر بعض روایات میں موجود ہے اور وہ دونوں ایسے ہیں کہ جو نہ صرف ایک دوسرے کی تائید نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی مخالفت میں ان کی رائے سب صحابہ کی رائے کے موافق ہے اور مصحف عثمانی کو صحیح قرار دیتی ہے۔ ابی دُعائے قنوت کو قرآن میں لکھتے ہیں تو ابن مسعودؓ باقی صحابہؓ کے ساتھ انہیں غلطی پر قرار دیتے ہیں۔ ابن مسعود معوذتین کو قرآن میں نہیں لکھتے تو ابی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ انہیں غلطی پر قرار دیتے ہیں۔ پس ایک اکیلے آدمی کی رائے ہزارہا آدمیوں کی متفقہ شہادت کے خلاف جو علم کی بنا پر مبنی ہے کیا وقعت رکھتی ہے +

بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے صحابہؓ صحیح علم اس بات کا رکھتے تھے کہ معوذتین قرآن کریم کا حصہ ہیں اور یہ علم ان کا بلا واسطہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ ابی کی شہادت کا اُوپر ذکر ہو چکا۔ اور بھی بہت سے صحابیوں سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی بار ان سُورتوں کو نماز میں پڑھا۔ دُعائیہ جملوں کے طور پر نہیں بلکہ قرات کے طور پر یعنی بجائے کوئی اور حصہ قرآن کا پڑھنے کے انھیں سُورتوں کو پڑھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خود دُعائیہ جملے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نماز میں پڑھا کرتے تھے جیسے دُعاء القنوت وہ قرأت کی بجائے نہ ہوتے تھے مگر معوذتین کو قرات کے طور پر پڑھا۔ اور یہی صحابہ کو سکھایا چنانچہ کئی صحابیوں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کو نماز میں پڑھا کرو۔ مثلاً ایک صحابی سے روایت ہے ان النبي صلى الله عليه وسلم اقرأه المعوذتين وقال له اذا انت صليت فاقرأهما۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ابن مسعودؓ کو کیا غلطی لگی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ دونوں سُورتیں قل اعوذ برب سے شروع ہوتی ہیں دوسری طرف قرآن شریف میں حکم ہے اذا قرأت القرآن فاستعذ بالله یعنی جب تو قرآن شریف پڑھے تو اللہ کے نام کے ساتھ پناہ مانگ۔ اِدھر ان دونوں سُورتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نام کے ساتھ کس طرح پناہ مانگنی چاہیئے۔ ابن مسعودؓ نے یہ خیال کیا کہ اس کلام میں صرف وہ طریق سکھلایا گیا ہے جس طرح پناہ مانگنی چاہیئے۔ یہ خیال ہی خیال نہیں بلکہ ایک روایت میں ابن مسعودؓ کے یہ الفاظ موجود ہیں انما امر النبي صلى الله عليه وسلم ان يتعوذ بهما یعنی آنحضرت

معوذتین جزو قرآن ہیں۔

* خود اتقان میں نووی اور ابن حزم کی شہادت موجود ہے کہ یہ ابن مسعود پر جھوٹ ہے۔ منہ

صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ ان کے ساتھ پناہ مانگی جاوے جس سے انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ قرآن کریم کا جزو نہیں بلکہ پناہ مانگنے کا طریق سکھاتی ہیں۔ حالانکہ آنحضرتؐ کے اس حکم کا کہ ان کے ساتھ پناہ مانگی جاوے یہ نتیجہ نہیں نکلتا تھا کہ وہ خدا کا کلام یعنی جزو قرآن نہیں ہیں۔ اس سے حضرت ابن مسعودؓ کی غلطی کا صاف پتہ لگتا ہے۔ قاضی ابوبکر باقلانی نے ابن مسعودؓ کے اس فعل کی تشریح یوں کی ہے۔ اور اسی کی تائید قاضی عیاض نے بھی کی ہے۔ کہ ابن مسعودؓ نے ان کے جزو قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ صرف یہی کہا کہ ان کو قرآن کریم کے اندر نہ لکھا جاوے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہیں آنحضرت سے ان کا لکھنا ثابت نہ ہوا ہو۔ خواہ کچھ ہی صورت ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابن مسعودؓ کے اس خیال کی ایک بھی صحابی نے تائید نہیں کی۔ اور اسلئے چونکہ صحابہؓ کی متفقہ شہادت اسکی رائے کے خلاف ہے۔ اسلئے تاریخی طور پر بھی ہمیں اس کے خیال کو قطعاً غلط ٹھیرانا پڑتا ہے اور یہ اعتراض کہ وہ فاتحہ کو بھی اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے اس سے بھی زیادہ کمزور ہے کیونکہ کسی معتبر حدیث سے اس کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا صرف چوتھے طبقہ کی احادیث میں سے جن کا ذکر اوپر ہوا ایک حدیث اس بات کو بیان کرتی ہے جس کا ذکر جلال الدین سیوطی نے اتقان میں کیا ہے۔ اس حدیث میں جو واقعہ ابن مسعودؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ فاتحہ کو تمام قرآن کے لئے بطور خلاصہ سمجھا جاتا تھا شاید اسی وجہ پر انہوں نے قرآن کے اندر اسے نہ لکھا ہو۔ یا وہ سمجھتے ہوں کہ جس طرح معوذتین صرف قرآن کے ختم کرنے کیلئے ہیں فاتحہ اس کے شروع کرنے کے لئے ہے۔ اور انہیں قرآن کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں بہرحال ایک آدمی کے محض خیال کو ہزار ہا آدمیوں کی متفقہ شہادت کے خلاف جو وزن دیا جا سکتا ہے وہی ابن مسعودؓ کی ان باتوں کو صحابہؓ کے اتفاق کے مقابل دینا ہوگا۔ اختلاف قرات کا سوال جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں الگ حل کیا جائے گا۔

جمع زید میں کمی بیشی کے امکان کا خیال خلاف واقعات ہے

تیسرا اعتراض صرف ایک وہم ہی وہم ہے۔ جو کچھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء تھا اسی کے مطابق آپ کاتبان وحی سے لکھواتے اور اسی کے مطابق حافظان قرآن حفظ کرتے۔ اگر جمع قرآن صرف تنہا زیدؓ کا ہی کام ہوتا۔ اور اس میں دوسرے صحابہؓ ان کے معاون نہ ہوتے تو ایسے شکوک کے لئے جگہ مل سکتی کہ ممکن ہے زیدؓ سے بعض فقرات رہ گئے ہوں یا بعض فقرات ایسے انہوں نے درج کر دیئے ہوں جن کو قرآن شریف میں شامل کرنا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء نہ تھا لیکن جیسا کہ بہت سی احادیث کی متفقہ شہادت سے جو مختلف سلسلہ رواۃ سے ہم کو پہنچی ہیں ثابت ہوتا ہے زید کے معاون جمع قرآن کے کام میں کل صحابہؓ تھے جنہوں نے قرآن شریف کو لکھا ہوا تھا وہ اپنے اپنے لکھے ہوئے کاغذ لے کر حاضر ہوئے اور جنہوں نے حفظ کیا ہوا تھا ان کے حافظوں سے مدد لی گئی حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں بھی صحابہؓ کا جمع قرآن کے کام میں زیدؓ کے ساتھ شامل ہونا ثابت ہے۔ اور حضرت عثمانؓ کے وقت میں جب نسخے لکھے گئے اُس وقت بھی دیگر صحابہؓ کا زیدؓ کے ساتھ شامل ہونا ثابت ہے۔ پس اس صورت میں جبکہ ابھی بہت سے لوگ اُن صحابہؓ میں سے جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا زندہ تھے۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ کچھ فقرات جو اصل میں قرآن شریف میں شامل تھے غلطی سے شامل ہونے سے رہجاتے یا بعض فقرات ایسے شامل

ہو جاتے جن کے شامل کرنے کا حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا تھا۔ ایسی غلطی کا ارتکاب اکیلے آدمی سے ہو سکتا تھا۔ مگر جہاں ایک طرف حفاظ موجود ہوں دوسری طرف کل کی کل تحریریں اکٹھی کی گئی ہوں اور پھر وہ صحابہؓ جو دن رات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن شریف سُنتے تھے وہ موجود ہوں وہاں ایسی غلطی کا ارتکاب ناممکن ہے کیونکہ جو غلطی ایک شخص کرتا اسکی اصلاح دوسرے کر سکتے تھے۔ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ ایک آدھ صحابی سے کوئی غلطی ہو سکتی تھی بلکہ ہم اسبات کو لکھ چکے ہیں کہ اگر اُبیؓ اور ابن مسعودؓ کی مصاحف والی روایتیں درست ہیں تو ان بزرگوں سے بعض غلطیاں ہو جانے کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنی ہی رائے کے مطابق سب کام لیا۔ مگر ہم جس بات پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ زید کی جمع اور پھر نسخ مصاحف کے وقت ایسی امکانی غلطیوں کی اصلاح کے اتنے بڑے بڑے ذرائع موجود تھے کہ غلطی کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ اُس کا وقوع ثابت ہو۔ زید نے بڑی محنت سے قرآن شریف کو جمع کیا جو کامل سُورتیں نازل ہوئی تھیں اُن کو سُورۃ سُورۃ کرکے جمع کیا اور جہاں متفرق آیتیں نازل ہُوئی تھیں ایک ایک آیت کرکے انہیں تلاش کیا اور پھر اُن تمام تحریروں پر تائید میں شہادت حافظان قرآن کی موجود تھی اگر خالی تحریر کا ہی اعتبار کیا جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ کوئی آیت رہ گئی ہوگی مگر وہاں حافظ بھی سب جمع تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو سارا قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کے سامنے حفظ کر چکے تھے۔ اور اسلئے زید خُوب جانتے تھے کہ کس حصہ یا کس آیت کی تلاش ابھی کرنی چاہیئے چنانچہ جمع قرآن کے بارہ میں جو حدیث آئی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں زید کہتے ہیں فلاں آیت کو میں نے تلاش کیا یہانتک کہ اسے فلاں شخص کے پاس پایا یعنی آیت کا علم تھا اور تحریر کو تلاش کیا یہاں تک کہ تحریر بھی مل گئی۔ پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ایک یا دو حافظوں پر ہی سارا اعتبار نہیں کیا بلکہ کُل کے کُل کو جمع کیا۔ ممکن تھا کہ ایک حافظ سے کہیں غلطی ہو جائے مگر اس کی اصلاح دوسرے فی الفور کر سکتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسی غلطی کی اصلاح کا دوسرا ذریعہ تحریر تھی کیونکہ ہر ایک آیت بعد نزُول فی الفور ضبط تحریر میں بھی لائی جاتی تھی۔ یہ ایسا پختہ انتظام تھا کہ کسی غلطی کے امکان کو باقی نہیں چھوڑتا کیونکہ باوجود ایک قسم کی قطعی شہادت کے موجُود ہونے کے زید مطمئن نہ ہوتے تھے جب تک کہ دوسری قسم کی شہادت نہ مل جائے۔ حافظ کی تائید تحریر سے اور تحریر کی حافظہ سے ہوتی تھی۔ اسی دوسری شہادت کی طرف حدیث جمع قرآن میں زیدؓ اشارہ کرتے ہیں۔ جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں تحریروں اور آدمیوں کے سینوں سے قرآن شریف کو اکٹھا کرنے لگا۔ باقی رہا ناسخ منسوخ کا سوال سو اس کا اس مضمون زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں اور چونکہ وہ خود لمبا مضمون ہے۔ اسلیئے اس کو بھی کہیں الگ عنوان کے نیچے بحث کے لئے چھوڑتا ہوں لیکن جو اعتراض کیا گیا ہے اسکے جواب میں اتنا کہدینا ضروری ہے کہ اگر ہم اس بات کو فرض بھی کرلیں کہ کوئی آیت کبھی منسوخ کی گئی تو صحابہؓ اس سے بیخبر نہ ہو سکتے تھے کیونکہ جس چیز کو آپ نے منسوخ کرنا ضروری سمجھا ہو اس کا اعلان اور اسکی اشاعت بھی اسی طرح کی ہوگی جس طرح کسی آیت کے نزُول کی +

اب ہم چوتھے اعتراض کی طرف آتے ہیں جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ بعض احادیث میں بعض قرآن کریم کے

قرآن میں کچھ بڑھایا گیا نہ کچھ گھٹایا گیا

وہ فقرات محفوظ ہیں جو حضرت ابوبکر یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے وقت شامل نہیں کیے گئے حالانکہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جزو قرآن سمجھے جاتے اور قرآن شریف میں پڑھے جاتے تھے۔ درحقیقت یہی اعتراض سب سے بڑا اعتراض ہے! اور اس پر بہت مفصل بحث درکار ہوگی ہم اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ ایسی حدیثیں موجود نہیں۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ وہ قابل اعتبار ہرگز نہیں ہاں بعض مقامات پر بعض الفاظ کے معنوں کی غلط فہمی کی وجہ سے بھی اعتراض پیدا ہوئے ہیں قبل اس کے کہ ان احادیث پر ہم ایک ایک کرکے بحث کریں یہاں چند عام ریمارک کرتے ہیں جو امید ہے ناظرین کو اصل بحث کے سمجھنے میں مدد دینگے۔ قرآن شریف کی حفاظت کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں دو باتیں ثابت کرنی ہیں! اوّل یہ کہ قرآن شریف میں کوئی لفظ یا کوئی فقرہ بڑھایا نہیں گیا اور دوم یہ کہ اصل میں سے کچھ چھوڑا نہیں گیا جو موجودہ قرآن میں نہ ہو ان میں سے امر اوّل کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ کوئی حدیث معتبر یا غیر معتبر۔ اصلی یا غیر اصلی ایسی نہیں پائی جاتی جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ فلاں آیات یا الفاظ جو اس وقت قرآن شریف میں پڑھے جاتے ہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہ پڑھے جاتے تھے سوائے اس ایک حدیث کے جس میں یہ ذکر ہے کہ ابن مسعودؓ معوذتین کو مصحف کے اندر نہ لکھتے تھے یا لکھے ہوئے کو کھرچ دیتے تھے اس پر بحث گذر چکی ہے! اور میں دکھا چکا ہوں کہ یہ ابن مسعودؓ کی صریح غلطی تھی وہ اکیلے اس خیال میں پڑ گئے تھے حالانکہ سارے کے سارے صحابہؓ حتےٰ کہ ابی بھی اس میں انکی مخالفت کرتے تھے غلطی کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ معوذتین صرف تعوذ کے لیئے ہیں اور ان کو قرآن شریف کے خاتمہ پر پڑھ لینا چاہیئے۔ قرآن شریف کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم جس سے ہر ایک سورۃ قرآن شریف کی شروع ہوتی ہے وہ صرف افتتاح کے لیئے ہے اور جزو سورۃ نہیں ہے! ایسا ہی خیال معوذتین کے متعلق ابن مسعودؓ کا معلوم ہوتا ہے لیکن اکیلے شخص کا خیال جو وہ بھی صریح طور پر واقعات کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تمام صحابہؓ کی متفقہ شہادت کے بالمقابل کیا وقعت رکھ سکتا ہے درانحالیکہ ان کی شہادت کی بنیاد قطعی اور یقینی علم پر تھی نہ ابن مسعودؓ کی طرح محض ایک خیال یا اجتہاد پر۔ اس ایک حدیث کے سوائے اور کوئی حدیث ایسی نہیں جس میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہو کہ فلاں آیت یا سورہ قرآن میں شامل نہ تھی اور اس امر کی تو قطعاً کوئی شہادت نہیں کہ زیدؓ یا عثمانؓ نے اپنی طرف سے کوئی آیت یا سورۃ ملا دی تھی اب جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن شریف میں کچھ بڑھایا نہیں گیا تو دوسری بات کا ثابت ہونا کہ اس میں سے کچھ گھٹایا نہیں گیا نہایت آسان ہو جاتا ہے کیونکہ پہلے امر کا ثبوت بھی اس دوسرے امر کے ثبوت کا ممد ہے ہم پوچھتے ہیں کہ نہ بڑھانے کے وجوہات کیا ہوئے! اگر قرآن شریف ایسی بے احتیاطی سے جمع کیا جاتا جیسا کہ مخالفین خیال کرتے ہیں کہ اس میں سے سورتوں کی سورتیں یا آیتیں رہ گئیں تو پھر اس بے احتیاطی کا اثر دوسرے پہلو پر بھی ہونا چاہیئے یعنی جیسے کچھ گھٹایا گیا تھا کچھ بڑھا بھی دیا جاتا۔ یا جیسے کچھ حصص رہ گئے تھے کچھ اور بھی داخل ہو جاتے کیونکہ دونوں طرف یکساں ہی اثر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر چونکہ قرآن شریف میں بڑھ جانے کی شہادت کسی کمزور حدیث سے بھی نہیں ملتی۔ اسلیئے یہ ماننا پڑیگا کہ حضرت زیدؓ نے بڑے درجہ کی احتیاط اور تحقیق سے جمع کا کام کیا۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ جس احتیاط اور تحقیق نے قرآن شریف میں کچھ زیادتی ہو جانے سے اس کلام پاک کو

محفوظ رکھا وہی اس میں سے کم ہو جانے سے بھی اس کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بن گئی! دراصل بات یہی ہے کہ حضرت زید نے اعلیٰ درجہ کی تحقیق کو کام میں لائے اور سامان حفاظت بھی سارے موجود تھے یعنی ایک طرف حافظان قرآن جن کو قرآن شریف کا ایک ایک حرف حفظ تھا اور دوسری طرف اصلی تحریریں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں پس ایک طرف سامان حفاظت کا پورا پورا موجود ہونا اور دوسری طرف حضرت زید کی اس قدر احتیاط یہی وہ بواعث تھے کہ جن کی وجہ سے قرآن شریف میں نہ کوئی زیادتی ہوئی اور نہ ہی کوئی کمی ہوئی +

نتائج کی بنیاد احادیث کی مجموعی شہادت پر رکھی جا سکتی۔

دوسری بات جس کو میں خصوصیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ حدیثوں سے استدلال کا طریق جو یورپین مصنف اختیار کر رہے ہیں بالکل غلط ہے یہ لوگ عموماً اپنے نتائج کی بنیاد حدیث کی مجموعی شہادت پر نہیں رکھتے بلکہ جہاں اعتراض کرنے کی غرض ہو یا پہلے دل میں کوئی خیال بیٹھا ہوا ہو تو ایک کمزور سے کمزور حدیث بلکہ بعض وقت وضعی حدیث کو بنیاد ٹھہرا کر اس پر ایک عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ خواہ اس حدیث کے خلاف معتبر احادیث میں کتنی ہی وزنی شہادت کیوں موجود نہ ہو! اور خواہ وہ نتیجہ جو نکالا گیا ہے حدیث کی مجموعی شہادت کی رُو سے کتنا ہی لغو ثابت ہوتا ہو۔ اب جو ذخیرہ احادیث کا ہمارے سامنے موجود ہے اس میں ہر ایک قسم کی احادیث شامل ہیں اور محدثین نے شاقہ محنتوں کے ساتھ معتبر اور غیر معتبر احادیث کو الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلئے ایک محقق یا منقد کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ احادیث کے ملے جُلے ذخیرہ میں سے ایک حدیث لیکر جو نتیجہ اس سے نکل سکے نکالے بلکہ قبل ایسا نتیجہ نکالنے کے اسکو کئی امور پر غور کرنا چاہیئے! احادیث کے مجموعوں میں سے وہ مجموعہ جو امام بُخاری نے جمع کیا اور جو صحیح بخاری کے نام سے موسُوم ہے سب سے زیادہ معتبر ہے! اور جہاں احادیث سے متضاد شہادت ملتی ہو یعنی بعض احادیث کی شہادت بعض کے مخالف ہو تو مامون طریق ایسی صُورت میں یہ ہے کہ بُخاری کی حدیث کو مقدم کیا جاوے کیونکہ خود امت کا اجماع اسبات پر ہو گیا ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ بُخاری شریف ہے پس احادیث سے شہادت لیتے وقت پہلا قاعدہ جو ایک محقّق یا منقد کو مدّنظر رکھنا چاہیئے یہ ہے کہ معتبر اور غیر معتبر احادیث میں فرق کیا جاوے بغیر اس قاعدہ کو مدّنظر رکھنے کے ہم صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے! اسبات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں ہم صرف اس صُورت کا ذکر کر رہے ہیں۔ جب بعض احادیث سے بعض کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہو۔ لیکن جہاں حدیث کا اختلاف قرآن سے ہو تو ایسی صورت میں حدیث کو رد کرنا پڑیگا۔ خواہ وہ کسی قسم کی ہو دوسرا قاعدہ جو احادیث کی شہادت کو وزن کرتے وقت مدنظر رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب احادیث ایک سی ہی معتبر یا غیر معتبر ہوں تو دیکھنا چاہیئے کہ زیادہ شہادت کس طرف ہے مگر سب سے ضروری اور یقینی معیار یہ ہے۔ کہ عملی تواتر کس بات کو صحیح ٹھیراتا ہے +

اب ہم ان تین معیاروں کی رُو سے ان احادیث کو پرکھیں گے۔ جو حفاظت قرآن کریم کے سوال کے متعلق ہیں لیکن اس سے پہلے ان احادیث کا بیان کرنا ضروری ہے۔ جن پر اعتراضوں کی بنا رکھی گئی ہے۔ ان احادیث کو میں تاویل القرآن سے لیتا ہوں۔ جو سخت معاندانہ رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اور جس کے مصنف نے ایسی احادیث کے جمع کرنے میں سخت محنت اُٹھائی ہے۔ اگرچہ اُوپر میں نے یہ کہا تھا۔ کہ ہم اس کتاب کے مجنونانہ دعوؤں کی طرف کوئی توجہ نہ کرینگے۔

وہ احادیث جنمیں مذکورہ ترتیب کے خلاف سورت یا آیت قرآن میں بھی نہیں ہے

لیکن تاہم اس مضمون میں ان تمام باتوں کا جواب دیا گیا ہے یا دیا جاویگا جن کی بنا ایسے امور پر ہے جو احادیث کی شہادت سے پیدا ہوں خواہ ایسی احادیث معتبر ہوں یا غیر معتبر۔ احادیث پیش کردہ یہ ہیں (۱) صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ میں ابوالاسود سے یہ روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے بصرہ میں حسب ذیل الفاظ قراء کی ایک جماعت کے سامنے بیان کیئے۔ انا کنا نقرأ سورۃ نشبهها فی الطول والشدۃ ببرأۃ فانسیتها غیر انی قد حفظت منها۔ لوکان لابن ادم وادیان من مال لابتغی وادیا ثالثا۔ ولا یملاء جوف ابن ادم الا التراب وکنا نقرأ سورۃ کنا نشبهها باحدی المسبحات فانسیتها غیر انی قد حفظت منها یاایها الذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون فتکتب شهادۃ فی اعناقکم فتسئلون عنها یوم القیمۃ +

(۲) مسلم کتاب الرضاع میں حضرت عائشہ سے حسب ذیل روایت ہے۔ عن عائشۃ انها قالت کان فیما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات ثم نسخن بخمس معلومات فتوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهی فیما یقرأ من القرآن +

(۳) مسلم کتاب الحدود میں حسب ذیل روایت ہے عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنهما یقول قال عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ وهو جالس علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ بعث محمدا صلی اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب وکان مما انزل اللہ علیہ ایۃ الرجم قرأناها ووعیناها وعقلناها۔ فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللہ تعالٰے فیضلوا بترک فریضۃ انزلہ اللہ وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ اوکان الحمل اوالاعتراف۔ اور ایسا ہی سنن ابی داؤد کتاب الحدود باب الرجم میں یہ روایت ہے۔ عن عبداللہ بن عباس ان عمر یعنی ابن الخطاب رضی اللہ تعالٰے عنہ خطب فقال ... فالرجم حق علی من زنا من الرجال والنساء اذا کان محصن اذا قامت البینۃ اوکان حمل او اعتراف وایم اللہ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ عزوجل لکتبتها +

(۴) عن عائشۃ قالت کانت سورۃ الاحزاب تقرأ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مائتی ایات فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منها الا ما هو الان (کتاب الاتقان جلد ۲ صفحہ ۳۰)۔

(۵) عن مالک ان اولها لما سقط معہ البسملۃ ثبت انها کانت تعدل البقرۃ لطولها۔ وفی مصحف ابن مسعود مائۃ واثنتا عشرۃ سورۃ لانہ لم یکتب المعوذتین وفی مصحف ابی ستۃ لانہ کتب فی اخر سورتی الحفد والخلع (اتقان جلد اول صفحہ ۸۱) +

ان پانچ احا[دیث] کی تردید دو[سری] صحیح احادیث [سے] ہوتی ہے

یہ وہ پانچ حدیثیں ہیں جن کی بنا پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ بعض آیات یا فقرے یا سورتیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں قرآن شریف میں پڑھی جاتی تھیں۔ اس وقت قرآن شریف میں موجود نہیں۔ اب پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا کوئی ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جن سے ان احادیث کی تردید ہوتی ہو۔ اگر ایسی احادیث ملتی ہوں تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان میں سے کونسی احادیث زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ شہادت کا وزن زیادہ تر کس طرف ہے۔ اور عملی تواتر اور مسلمہ واقعات تاریخی کونسی احادیث کو صحیح ٹھیراتی ہیں۔ جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصوں میں دکھا چکے ہیں۔ ایسی معتبر احادیث بہت کثرت سے ملتی ہیں جن سے ان احادیث کے بیانات کی تردید ہوتی ہے۔ اسلیئے اب ہم ان تین امور پر غور کرینگے۔ جن کا ذکر ابھی ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس بحث کو چھیڑیں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آخیری دو حدیثیں جو اتقان میں سے لیگئی ہیں۔ اس قابل نہیں کہ ان پر کوئی توجہ کیجاوے کیونکہ جیسا کہ شاہ عبد العزیز نے اپنے عجالہ نافعہ میں جو اصول علم حدیث پر لکھا گیا ہے۔ یہ بتا دیا ہے۔
جلال الدین سیوطی کی تصانیف میں ایسی احادیث پائی جاتی ہیں۔ جن کا نام ونشان ابتدائی زمانہ میں نہیں ملتا۔ اور اسلیئے ایسی احادیث کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔ پس اگر ان احادیث کی تردید معتبر احادیث سے نہ بھی ہوتی ہو توبھی یہ اس قابل نہیں۔ کہ ان کی بنا پر کوئی اعتراض کیا جاوے۔ بلکہ وہ خود اپنی تردید کے لیئے آپ ہی کافی ہیں اس طرح پر اتقان کی دونوں حدیثوں کے رد کرنے کے بعد مسلم کی تین حدیثیں رہ جاتی ہیں پس اصول اول کے مطابق جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ سب سے پہلے ہم بخاری کو دیکھیں گے۔ کہ آیا اس میں ایسی حدیث پائی جاتی ہے۔ جو مسلم کی ان احادیث کی تردید کرتی ہو۔ کیونکہ صحیح بخاری وہ کتاب ہے۔ جس کو بالاجماع اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا گیا ہے۔ اور مسلم یا کسی دوسری کتاب کو ایسا مرتبہ حاصل نہیں۔ پس اگر مسلم کی کوئی حدیث یا کسی اور کتاب کی حدیث بخاری کی تردید کرتی ہو۔ تو ہمیں ایسی حدیث کو رد کرنا پڑیگا۔ لیکن ان احادیث کی شہادت کی تردید نہ صرف بخاری سے ہی ہوتی ہے۔ بلکہ خود انہی کتابوں یعنی مسلم وغیرہ میں کثرت سے ایسی حدیثیں پائی جاتی ہیں۔ جو ان تین حدیثوں کی تردید کرتی ہیں۔ چونکہ حفاظت قرآن کے مضمون میں ہم ان احادیث کا مفصل ذکر اپنی اپنی جگہ کرتے آئے ہیں۔ اور انہی کی بنا پر ہم نے یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر آج تک محفوظ چلا آیا ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی یا تغیر وتبدل نہیں ہوا۔ لہذا ان احادیث کے اعادہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں +

حدیث ابوموسیٰ کے راویوں پر بحث

اب ہم ان تینوں کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں تک قابل اعتبار ہیں۔ پہلی حدیث میں ابوموسیٰ اشعری کے خطبہ کا ذکر ہے۔ جو اس نے قراء بصرہ کے سامنے دیا۔ اور جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ وہ یعنی ابوموسیٰ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابہؓ دو سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ جن میں سے اب صرف ایک ایک فقرہ ہی اسے یاد رہگیا۔ اور پہلی سورۃ کے فقرہ کا مضمون یہ ہے۔ کہ اگر ابن آدم کیلیئے مال کی دو وادیاں ہوتیں تو وہ ایک تیسری وادی کی تلاش کرتا اور ابن آدم کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ اور

دوسری سورۃ کے فقرہ کا یہ مضمون ہے۔ کہ اے ایماندارو تم وہ بات کیوں کہتے ہو۔ جو کرتے نہیں۔ اس کی شہادت تمہارے خلاف لکھی جائیگی اور قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق باز پرس کیجائیگی۔ خود مسلم سے جو بیرونی اور اندرونی شہادت اس روایت کے متعلق ملتی ہے وہ اسکو مردود ٹھیراتی ہے۔ بیرونی شہادت کے لئے سب سے پہلے اس کے سلسلہ رواۃ کو دیکھنا چاہئے۔ اس روایت کے راویوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے سوید بن سعید ہے۔ اور اس لئے سب سے پہلے ہم اسی کو لیتے ہیں۔ کہ اس کی روایت کہاں تک قابل اعتبار ہوسکتی ہے۔ راویوں کی جرح پر ذہبی کی میزان الاعتدال سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے۔ اس کتاب میں سوید بن سعید کے متعلق یہ لکھا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے جن میں مسلم بھی ہیں۔ اس کی روایت کو لیا ہے لیکن اکثر نے اس کی روایت کو مردود سمجھا ہے۔ اور اس بات پر قریباً قریباً سب کا اتفاق ہے۔ کہ وہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا۔ اور آخرکار اندھا ہوگیا۔ اور اس وقت وہ بعض ایسی حدیثیں بیان کر دیتا تھا۔ جو در اصل اس کی حدیثیں نہ تھیں۔ امام بخاری کے اس کے متعلق یہ الفاظ ہیں انہ ضعیف جداً۔ ایسا ہی ایک واقو کا اس کتاب میں ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا میلان شیعہ مذہب کی طرف تھا۔ لکھا ہے کہ ایک شخص اس کے پاس کتاب الفضائل لایا تو اس نے علیؓ کو اول اور ابوبکرؓ کو آخر کر دیا بہت سے لوگوں نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ اور بعض نے اس کو کذاب کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ متہم بالزندقہ ہے۔ یہ اس راوی کا حال ہے۔ جس کے منہ سے مسلم نے اس حدیث کو لیا ہے۔ اور جب اس کی نسبت اس قدر بے اعتباری کی شہادت ملتی ہے تو ہمیں ضرورت نہیں کہ اب ہم اس حدیث کے دوسرے راویوں پر غور کریں +

اس حدیث کے خلاف مسلم کی اپنی شہادت

ایک اور قسم کی خارجی شہادت خود مسلم سے ملتی ہے جس سے حدیث زیر بحث کی وقعت کچھ بھی نہیں رہتی۔ اس حدیث سے پہلے خود مسلم نے اسی مضمون کی چار اور حدیثیں نقل کی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ سوید کی حدیث سے جو الفاظ ابی موسیٰ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ قرآن شریف کی دو سورتوں کے ٹکڑے تھے لیکن ان چاروں حدیثوں میں اس بات کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ مسلم کتاب الزکوٰۃ باب لو ان لابن ادم وادیین لابتغی ثالثا میں سب سے پہلی حدیث یہ ہے۔ حدثنا یحیی بن یحیی وسعید بن منصور وقتیبۃ بن سعید قال یحیی انا وقال الاخران ثنا ابو عوانہ عن قتادۃ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان لابن ادم وادیان من مال لابتغی وادیا ثالثا ولا یملاء جوف ابن ادم الا التراب ویتوب اللہ علی من تاب۔ یعنی یحییٰ بن یحییٰ اور سعید بن منصور اور قتیبۃ بن سعید ان تینوں نے حضرت انس سے یہ روایت مسلم کو پہنچائی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اگر آدمی کے لیئے دو وادیاں بھی مال کی ہوتیں۔ تو بھی وہ تیسری کی خواہش کرتا۔ اور آدمی کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی یعنی آخر موت سے ہی اس کی خواہشات اور حرص کا خاتمہ ہوتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ خدا بھی اس پر رجوع بہ رحمت کرتا ہے۔ اب اس روایت کے بموجب حضرت انسؓ یہ روایت کرتے ہیں کہ وہی لفظ یعنی لو کان لابن ادم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائے

تھے۔ اوران کو قرآن کا جزو قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اب مسلم کی یہ دونوں روایتیں ایکدوسرے کے مخالف شہادت دیتی ہیں یعنی ایک طرف تو سوید کی روایت جس کے رُو سے لوکان لابن آدم الخ کو کسی بھولی ہوئی سورت کی آیت قرار دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف یحیے بن یحیے اور سعید بن منصور اور قتیبہ بن سعید تینوں کی متفقہ روایت ہے جس کے رُو سے انہی الفاظ کو قرآن شریف کا جزو نہیں بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ قرار دیا گیا ہے! اسلئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں روایتوں میں سے ہم زیادہ اعتبار کس پر کر سکتے ہیں سوید کے متعلق جو رائے محدثین کی ہے۔ اسکو ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں! اب اِن تینوں راویوں میں سے سعید بن منصور اور یحیے بن یحیے دونوں کو ذہبی نے میزان الاعتدال میں صریح الفاظ میں ثقہ بیان کیا ہے۔ اور تیسرے یعنی قتیبہ بن سعید کے متعلق لکھا ہے۔ کہ اس کا حال کچھ معلوم نہیں۔ بہرحال اس حدیث کی شہادت پہلی حدیث سے بہت بڑھ کر وزنی ہے۔ کیونکہ وہاں تو صرف ایک آدمی کی روایت ہے اور وہ بھی ایسا جس کو اکثر محدثین نے ناقابل اعتبار اور ضعیف اور متروک الحدیث مانا ہے اور بعض نے زندیق اور کذاب تک کہا اور یہاں کم از کم دو ایسے راویوں کی شہادت ہے جن کو سب محدثین نے ثقہ تسلیم کیا ہے! اسلیئے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس حدیث کی شہادت حدیث زیر بحث سے بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ پس جب یہ حدیث قابل تسلیم ہے۔ تو حدیث زیر بحث ضرور مردود ٹھہرتی ہے۔ پھر اس کے علاوہ تین اور حدیثیں اسی مضمون کی مسلم نے بیان کی ہیں! اور ان سب میں ان الفاظ لوکان لابن آدم الخ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منہ کے الفاظ اور آپ کی حدیث قرار دیا گیا ہے۔ اور کسی ایک میں بھی یہ نہیں کہا گیا۔ کہ وہ جزو قرآن تھے! ان تین میں سے ایک حدیث میں ابن عباسؓ کی طرف جو اس کے پہلے راوی ہیں یہ الفاظ منسوب کیئے گئے ہیں۔ فلا ادری امن القرآن ھو ام لا۔ یعنی میں نہیں جانتا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں یا نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری روایت میں انہی الفاظ فلا ادری أمن القرآن کے تعلق میں ابن عباس کا ذکر نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی پچھلے راوی کے لفظ ہیں +

اِن تمام واقعات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ خود مسلم نے اس ایک حدیث کے خلاف چار اور حدیثیں بیان کر کے اس کو ایک حد تک ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ اور کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کتاب میں ہم پانچ حدیثیں ایسی پاتے ہیں جن میں چار کی شہادت پانچویں کے مخالف ہے! اور پھر ان چار حدیثوں کو پانچویں حدیث کی نسبت بلحاظ راویوں کے زیادہ قابل اعتبار بھی پاتے ہیں۔ تو ان چار حدیثوں کی شہادت کے بالمقابل پانچویں حدیث کی شہادت کو رد کرنا پڑیگا۔ اِس بارہ میں یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ خود مسلم نے ان چار حدیثوں کو پہلے اور اس پانچویں حدیث کو جو ان کے مخالف ہے سب سے اخیر بیان کر کے یہ جتا دیا ہے۔ کہ یہ حدیث ان کے مقابل بہت کم وزن رکھتی ہے یہ صرف قیاس ہی قیاس نہیں بلکہ مسلم نے صحیح مسلم کے دیباچہ میں خود اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ کہ جن حدیثوں کو اس نے زیادہ قابل اعتبار سمجھا ہے۔ ان کا ذکر بھی پہلے کیا ہے! اور جن حدیثوں کو کمزور سمجھا ہے! ان کا

ذکر بعد میں کیا ہے چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔ فاما القسم الاول فانا نتوخی ان نقدم الاخبار التی ھی اسلم من العیوب من غیرھا وانقی من ان یکون ناقلوھا اھل استقامۃ فی الحدیث واتقان لما نقلوا۔ لم یوجد فی روایتھم اختلاف شدید ولا تخلیط فاحش کما قد عثر فیہ علی کثیر من المحدثین وبان ذلک فی حدیثھم فاذا نحن تقصینا اخبار ھذا الصنف من الناس اتبعناھا اخبارًا یقع فی اسانیدھا بعض من لیس بالموصوف بالحفظ والاتقان کالصنف المقدم قبلھم۔ یعنی امام مسلم کہتے ہیں۔ کہ ہم نے اس قاعدہ کی پیروی کی ہے۔ کہ ان حدیثوں کو پہلے رکھیں۔ جو دوسری حدیثوں کی نسبت عیبوں سے زیادہ محفوظ ہیں۔ اور ان کے نقل کرنے والے حدیث میں اہل استقامت اور اہل اتقان ہیں۔ ان باتوں میں جن کو انہوں نے نقل کیا اور اُن کی روایت میں اختلاف شدید یا بڑا خلط نہیں پایا جاتا جیسا کہ اکثر محدثین کو ان پر اطلاع ہوئی ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں۔ کہ جب ہم اس قسم کی حدیثوں کو بیان کر چکتے ہیں۔ تو ان کے بعد اس قسم کی حدیثیں لاتے ہیں۔ جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی بھی ہیں جو حفظ اور اتقان میں پہلے راویوں کی طرح نہیں۔ ان الفاظ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود مسلم نے حدیث زیر بحث کو وہ وقعت نہیں دی جو ان حدیثوں کو جن سے اس کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہے ٭

حدیث ابو موسیٰ پر اندرونی شہادت

حدیث زیر بحث کے بطلان کو اور بھی واضح کرنے کے لئے اب ہم اس اندرونی شہادت پر غور کرتے ہیں۔ جو خود اس حدیث سے پیدا ہوتی ہے۔ اوّل تو خود اس فقرہ کی عبارت اس طرز کی ہے۔ کہ کوئی شخص جس نے قرآن شریف کو پڑھا ہے۔ اسے قرآن شریف کا جزو قرار نہیں دے سکتا۔ ثانیًا وہ الفاظ جو ابو موسیٰ اشعری کی طرف منسوب کیئے گئے ہیں۔ اس حدیث کے جھوٹا ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں۔ کنا نقرأ سورۃً یعنی ہم ایک سورۃ پڑھا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس حدیث کے مطابق وہ اکیلے ہی ایسے آدمی نہ تھے جن کو وہ سورۃ حفظ یاد ہو۔ بلکہ ان کی طرح دوسرے صحابہؓ کو بھی یاد تھی۔ اسلیئے یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ یہ سورۃ تمام صحابہؓ میں شہرت رکھتی تھی۔ اب اگر اس بات کو فرض کر لیا جائے۔ کہ یہ ممکن تھا۔ کہ ابو موسےٰ اشعری ساری سورۃ کو یکایک بھول جائیں۔ اور صرف ایک ہی فقرہ اُن کو یاد رہ جائے۔ تو یہ کیونکر ہوا کہ باقی تمام صحابی بھی اس کو ساتھ ہی بھول گئے۔ کوئی صحابی نہ اس سورۃ کا ذکر کرتا ہے۔ نہ نام لیتا ہے۔ کہ کبھی کوئی ایسی سورۃ قرآن شریف کا ایک حصہ تھی نہ ہی کسی صحابی نے اور اُنہی میں ابو موسےٰ اشعری بھی شامل ہے حضرت ابو بکرؓ کے وقت میں جب قرآن شریف جمع کیا جا رہا تھا زیدؓ کو یہ اطلاع دی کہ ایسی کوئی سورۃ بھی قرآن شریف میں داخل ہے۔ حالانکہ اس وقت عام طور پر اعلان کیا گیا۔ کہ جس شخص کے پاس کوئی حصہ قرآن کا ہو۔ جو اسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملا ہو وہ اسے لے آئے۔ پھر نہ معلوم اس وقت ابو موسیٰ اشعری اور دوسرے صحابہؓ جن کو یہ سورۃ حفظ تھی کہاں تھے۔ یا کیوں اُنہوں نے اسے پیش نہ کیا۔ ایسا ہی حضرت عثمانؓ کے وقت میں جب مصاحف کی نقل بڑے اہتمام سے کرائی گئی اُس وقت بھی کسی کی اطلاع میں یہ بات نہ آئی۔ کہ ایسی کوئی سورۃ بھی قرآن شریف میں ہے۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کے وقت سے لیکر جب قرآن شریف جمع کیا گیا۔

کسی قاری نے یا حافظ نے باوجود اسکے کہ صحابہ میں بہت سے لوگ ایسے موجود تھے کبھی اس بات کو پیش نہ کیا۔ کہ جو قرآن شریف حضرت ابوبکر رضؓ نے جمع کرایا تھا! اس میں ایک اتنی بڑی لمبی سورۃ کا نام و نشان تک پایا نہیں جاتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابوموسیٰ اشعری اور دوسرے تمام صحابہ جن کو سورۃ حفظ تھی! ور ایسا ہی تمام حافظان قرآن اس سورت کو حضرت ابوبکر کی جمع سے پہلے ہی بھول چکے تھے! اور تمام تحریریں بھی جن پر یہ سورۃ لکھی ہوئی تھی! اس وقت سے پہلے تلف ہو چکی تھیں۔ تو کم از کم اتنا تو ہوتا۔ کہ یہ چند لفظ جو ابوموسیٰ اشعری کو یاد رہ گئے۔ یعنی لو کان لابن آدم وادیان من مال الخ قرآن شریف میں درج کر دیئے جاتے! ابوموسیٰ اشعری صحابہ کو یاد دلاتے کہ ہم سب فلاں سورۃ پڑھا کرتے تھے۔ جس کو اب ہم سب بھول گئے ہیں۔ اور یہی ایک فقرہ یاد رہ گیا ہے۔ تو ضرور تھا۔ کہ صحابہ کو بھی یہ بات یاد آتی! اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ ابن مسعودؓ اور ابی کے پاس جو کہا جاتا ہے۔ کہ الگ نسخے قرآن شریف کے تھے۔ ان میں بھی اس سورۃ کا نام و نشان نہیں۔ پھر جب ابوموسیٰ نے اس بات کو بیان کیا۔ تو اس وقت بھی ہزارہا صحابیوں میں کسی ایک شخص نے بھی اس کی تائید نہ کی۔ اور تعجب پر تعجب یہ کہ وہ لوگ جو ایک ایک حدیث کے لئے مہینوں کے سفر کرتے اور محنت شاقہ اٹھاتے انمیں سے بھی کوئی ایک اس تحقیق کے درپے نہ ہوا۔ کہ اتنی بڑی لمبی سورتیں قرآن شریف کی جو کہ ابوموسیٰ کو بھول گئی تھیں ان کا کہیں پتہ لگاتا۔ بلکہ خود ابوموسے نے بھی کوشش نہ کی۔ کہ جو سورتیں اس کو بھول گئی تھیں ان کو تازہ کرنے کیلئے کچھ محنت اٹھاتا۔ اصل بات یہ ہے کہ حدیث میں جو بات بیان کی گئی ہے۔ وہ ایسی لغو اور دور از قیاس ہے۔ کہ ایک سمجھدار آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر یقین نہیں کر سکتا بس خارجی اور اندرونی شہادت دونوں نہایت صفائی سے اس بات کو ثابت کرتی ہیں۔ کہ حدیث زیر بحث سراسر جھوٹی ہے۔ اور اسکی صداقت پر ایک ذرہ بھر بھی شہادت نہیں ملتی۔ اور یہ امر کہ مسلم نے اس حدیث کو اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے۔ یہ کوئی اس کی صداقت کی شہادت نہیں۔ درانحالیکہ ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں۔ کہ خود مسلم بھی اسکو بہت ضعیف اور کمزور سمجھتا تھا۔ اور دوسری حدیثوں کو جن سے اس کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بہت زیادہ قابل اعتبار سمجھتا تھا +

حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث رضاع پر بحث

باقی دو حدیثیں جو مسلم نے بیان کی ہیں۔ اور جن کو اعتراض کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک پر ایسی ہی لمبی بحث کیجائے تو یہ مضمون بہت طول پکڑ جائیگا۔ ہم نے صرف مثال کے طور پر یہ بتا دیا ہے۔ کہ ایسی حدیثوں پر خواہ وہ مسلم میں ہی موجود ہوں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور تحقیق سے ایسی حدیثیں بالکل جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔ پس باقی ماندہ دو حدیثوں کے متعلق ہم صرف ان کی اندرونی شہادت کے متعلق ہی مختصر طور پر کچھ ذکر کرینگے۔ ان میں سے ایک حدیث کا جو نمبر ۲ پر دیگئی ہے۔ یہ مضمون ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے یہ بیان کیا تھا کہ قرآن شریف میں ایک آیت تھی جسمیں صراحت سے یہ ذکر تھا۔ کہ دس بار دودھ چوسنے سے حرمت رضاعی ثابت ہوتی ہے! اور کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اور اس کی بجائے ایک اور حکم نازل ہوا جس میں دس بار کی بجائے پانچ بار کا دودھ چوسنا حرمت رضاعی کے لئے کافی سمجھا گیا اور کہ یہ آخری حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن شریف میں پڑھا جاتا تھا۔ جو کچھ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے! اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا حکم

حضرت عائشہ کے سوا دوسروں کو بھی معلوم تھا۔ اور وہ اس کو قرآن شریف میں پڑھا کرتے تھے۔ درحقیقت اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ اگر کوئی ایسا حکم نازل ہوتا۔ تو اس کی شہرت عام ہوتی۔ کیونکہ یہ حکم ایسا تھا۔ جو روزمرہ استعمال میں آنیوالا تھا عرب میں بچوں کو عموماً دودھ دایہ سے پلایا جاتا تھا اور ایسی صورت میں یہ ضرور تھا۔ کہ ہر ایک شخص کو اس بات کا علم ہوتا۔ کہ کون کونسی عورتیں اس پر رضاعت کی وجہ سے حرام ہیں۔ پس اگر ایسی کوئی آیت قرآن شریف میں نازل ہوتی۔ تو اس کا علم کبھی ایک شخص تک محدود نہ رہ سکتا تھا۔ بلکہ اس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہئیے تھی محدثین نے یہ اصول قائم کیا ہے۔ کہ اگر کسی حدیث میں کسی ایسے واقعہ کا تذکرہ ہو جس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہئیے مگر وہ لوگ جن کو اس کا علم ہونا چاہئیے تھا۔ اس کے متعلق کچھ اطلاع نہ دیں۔ اور اس سے لاعلمی ظاہر کریں۔ تو ایسی حدیث کے وضعی ہونے کی یہ شہادت کافی ہے۔ درحقیقت اگر غور کیا جائے۔ تو یہ اصول نہایت معقول ہے۔ جب ہم اس کے رُو سے حدیث زیر بحث کو پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اصلی نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا حکم رضاعت کے متعلق عام طور پر لوگوں کے علم میں آنا چاہئیے تھا اور ضروری تھا کہ کثرت سے روایات اس کے متعلق ہوتیں۔ حدیث میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک آیت عام طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پڑھی جاتی تھی۔ اب جب حضرت ابوبکرؓ نے قرآن شریف کو جمع کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چھ ماہ کا عرصہ گذرا تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ اس قدر تھوڑا عرصہ گذرا تھا ایک شخص نے بھی حضرت ابوبکر یا زید کو اطلاع نہ دی کہ ایسی کوئی آیت بھی قرآن شریف میں ہے۔ بلکہ حضرت عائشہ نے بھی جن کی طرف یہ روایت منسوب کی جاتی ہے ایسی اطلاع نہیں دی۔ اور بالفرض اگر وہ زیدؓ کو اطلاع نہ دے سکتی تھیں تو کیا اپنے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی نہ دے سکتی تھیں۔ پھر حضرت عثمان کے وقت میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں۔ مگر اس وقت بھی ایسی کسی آیت کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ عمرہ کو تو کئی سال بعد حضرت عائشہ ایسی آیت کا پتہ بتائیں لیکن خود اپنے والد کو جمع قرآن کے وقت نہ بتائیں اور اس وقت جبکہ عام اعلان کیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس کوئی آیت ہے وہ اسے لے آوے خاموشی اختیار کریں اور پھر یہ بھی عجیب بات ہے۔ کہ حضرت عائشہؓ کے سوا کوئی شخص ایسی آیت کا نام تک نہیں لیتا علاوہ اس کے جیسا کہ پچھلی حدیث کی بحث میں دکھایا جا چکا ہے خود مسلم کے اسی باب کی دیگر احادیث سے اس حدیث کے جھوٹا ہونے کی شہادت ملتی ہے کیونکہ ان احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی کو ایسی کسی آیت کی کوئی خبر نہ تھی۔ بلکہ اسی باب میں ایسی احادیث خود حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابیوں سے مروی ہیں جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کئے گئے ہیں کہ کتنی دفعہ کی رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایسی کوئی صاف آیت قرآن شریف میں وارد ہوتی کہ پانچ یا دس دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت قطعی ہو جاتی ہے۔ تو ایسے سوال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کیوں پوچھے جاتے۔ نہ ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انہی سوالوں کے وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا کوئی تذکرہ حدیث میں نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ اگر ایسا واقعہ ہوتا تو اس کا تذکرہ حدیث میں بھی ضرور ہوتا +

حضرت عمرؓ کی حدیث رجم

رہی تیسری حدیث سو اس کا بھی اب اِس جگہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات غور کے قابل ہے کہ اگر اس حدیث کے وہی معنے صحیح ہوں جو مخالف معترض کھینچ تان کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو جو الفاظ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیئے جاتے ہیں وہ ان کی زبان سے نکلے ہوئے کبھی ثابت نہیں ہو سکتے۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ سے معترض یہی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کو ایک ایسی آیت یاد تھی جس میں زانی مردوں اور عورتوں کی سزا کا ذکر تھا لیکن یہ آیت قرآن میں درج نہیں ہوئی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ یہ آیت پڑھی جاتی اور یاد کی جاتی تھی۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خود اور ان کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین اس پر عمل کرتے اور اس کے مطابق حکم کیا کرتے تھے۔ اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جبکہ ہم اسبات کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا جمع قرآن میں سب سے بڑا دخل تھا اور جمع شدہ قرآن شریف انکی خلافت کے زمانہ میں اُن کے قبضہ میں ہی تھا تو پھر کیا وجہ پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس آیت کو درج نہ فرمایا؟ اِس آیت کے متعلق صرف تین قیاس کیئے جا سکتے ہیں (۱) یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے (۲) یا یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے اور دوسرے صحابہؓ اس سے متفق نہ تھے (۳) یا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نہ حضرت عمرؓ اور نہ دوسرے صحابہؓ ہی اس کے آیتِ قرآنی ہونے پر متفق تھے۔ ان قیاسات میں سے صرف پہلا قیاس ہی ایسا ہے جس سے معترضین کی نکتہ چینی کو کچھ رونق مل سکتی ہے لیکن اگر ایسا ہی ہوتا کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کرام اس بات پر متفق ہوتے کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے تو ان کو کس بات نے روکا تھا کہ اسے درج قرآن نہ کیا؟ اسلیئے یہ قیاس بالکل باطل ٹھیرتا ہے اور خصوصاً جب اُن لوگوں کے اخلاص اور دیانت و امانت اور تقوی و طہارت کی طرف توجہ کیجاتی ہے اور ان کے اِس دخل پر غور کی جاتی ہے جو جمع قرآن میں ان کو حاصل تھا۔ اور نیز جب اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ اس حکم کے اخفا سے ان کا کوئی ذاتی فائدہ نہ تھا تو ایسی حالتوں کے باوجود اس کا درج قرآن نہ ہونا اِس قیاس کے بطلان پر قوی دلیل ہے +

اِسی طرح دوسرا قیاس بھی غلط ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس بات کی کہیں ذرا بھی شہادت نہیں ملتی کہ کبھی حضرت عمرؓ نے ایسا بیان کیا ہو اور صحابہؓ نے ان کی تردید کی ہو اور اگر بالفرض یہ مانا جائے کہ واقعی طور پر حضرت عمرؓ کے ایسے بیان کی دوسرے صحابیوں نے تردید کی تھی۔ تو حضرت عمر جب کسی دوسرے صحابی کو اپنا مُؤید نہ پاتے تو خود ہی اپنی غلطی سے رجوع کرتے۔ ان دونوں قیاسوں کے بطلان کے بعد صرف تیسرا قیاس ہی ایسا ہے۔ جس پر یہ مقدمہ ٹھیر سکتا ہے۔ لیکن اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ قیاس اس حدیث کے ساتھ کس طرح توافق کھا سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں دونوں متضاد بیانات کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر اصل بات یوں نہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ امر ظاہر ہو جائیگا کہ اگر اِس حدیث کے معنے تیسرے قیاس کے ساتھ متوافق نہ ہوں تو یہ حدیث ہی بے معنی اور عبث ٹھیر جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب کچھ زمانہ گذر جائیگا تو لوگ یہ کہنا شروع کر دینگے

کہ زانیوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب اللہ میں موجود نہیں۔ حالانکہ زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب میں صحیح طور پر موجود ہے۔ اگر کتاب اللہ سے مراد قرآن شریف سمجھا جائے تو یہ ایک صریح تضاد ہے اور اسلئے حدیث مذکور سراسر بے معنی ہے۔ کیونکہ پھر معنے یہ ہو نگے کہ سنگساری کا حکم قرآن شریف میں موجود ہے مگر مرور زمانہ کے بعد لوگ کہنے لگیں گے کہ ایسا حکم قرآن شریف میں نہیں لیکن لفظ "کتاب اللہ" جو اس حدیث میں وارد ہے۔ اگر اس کے مفہوم کو ذرا وسعت دیجاوے تو یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے سو واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن ہی ہو۔ کیونکہ یہی لفظ قرآن شریف میں بھی آیا ہے! اور وہاں اس کے معنے احکام الہی کے ہیں۔ چنانچہ والمحصنٰت من النساء الا ما ملکت ایمانکم کتاب اللّٰہ علیکم الخ میں "کتاب اللہ" کے معنے قرآن شریف نہیں بلکہ احکام الٰہی ہیں۔ سو ان معنوں کے رُو سے حدیث کے معنے درست ہو جاتے ہیں اور قرآن شریف کی حفاظت پر جو اعتراض بنایا گیا تھا وہ دور ہو جاتا ہے٭ +

متذکرہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موخر الذکر حدیث کے سوا کسی حدیث کی صحت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور آخری حدیث بھی ان معنوں میں صحیح تسلیم ہو سکتی ہے جو معترضین کے معنوں سے بالکل مختلف اور اوپر لکھے ہوئے معنوں کے موافق ہیں۔ البتہ بعض نکتہ چین لوگ یہ اعتراض پیش کر سکتے ہیں کہ ایسی وضعی حدیثوں کا مسلمانوں میں کیونکر رواج ہو گیا اور کیونکر اُن کو مشہور و معروف جامعان احادیث نے اپنی کتب میں درج کر لیا؟ اس امر کا بڑا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ حدیثیں اسلام میں لاکھوں تک مروّج ہوئیں اور انمیں بہت سی بناوٹی اور موضوع حدیثیں بھی تھیں۔ بہت سی ایسی احادیث زندیقوں نے وضع کیں جو بظاہر اسلام کے قائل مگر درپردہ دشمن تھے اور بعض شیعوں نے بھی بعد میں بہت سی احادیث بنا لیں۔ چنانچہ انہیں میں سے ایک حدیث کے راوی اول کے حالات سے ظاہر ہو چکا ہے۔ کہ وہ زندیق قرار دیا گیا تھا اور اس کا میلان رفض کی طرف پایا جاتا تھا لیکن امام مسلم رضؓ نے اس کی روایت پر اگرچہ بہت اعتبار تو نہ کیا لیکن قبولیت میں جگہ دیدی۔ اسکی غالب وجہ یہ تھی کہ جس وقت امام مسلم رضؓ نے اس حدیث کو نقل کیا تھا۔ اس وقت اس شخص کے دل کے اندرونی خیالات دیکھے نہیں گئے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ محدثین نے صحیح اور وضعی حدیثوں کے پرکھنے اور ان کے الگ کرنے میں بڑی سعی کی لیکن آخر وہ انسان ہی تھے عالم الغیب نہ تھے جہاں تک انسانی عقل پہنچ کر کوشش کرتی ہے انہوں نے اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر بشری نقصانوں سے وہ کیونکر بچ سکتے تھے۔ غرض ایسی وضعی احادیث جن میں اسلام پر باریک رنگ میں حملے کیئے گئے زندیقوں نے وضع کر کے ان کو شہرت دی اور اس طرح مسلمانوں میں وہ رواج پا گئیں۔ اور رواج پا کر معتبر شمار ہونے لگ گئیں علاوہ ازیں اس قسم کی وضعی حدیثوں کے بنانے اور رواج دینے میں بعض غالی شیعوں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل تو یہ لوگ صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق خلافت کو فوقیت اور ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جب انکے سامنے یہ بات پیش کی گئی کہ ان کے اس دعوے کی تائید میں کوئی آیت قرآنی نہیں۔ تو پھر انہوں نے خلفائے ثلاثہ کو کوسنا شروع کیا۔ اور ان پر جھوٹا الزام لگانا شروع کیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر وہ آیات قرآن میں درج نہیں کیں جو

ایسی احادیث کس طرح مروّج ہوئیں۔

٭ یہ صرف اس صورت میں ہے کہ حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے +

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق کی موید تھیں۔ اس عقیدے کو رواج دینے کے لئے اس قسم کی حدیثیں بنائی گئیں جن سے قرآن کریم میں نقصان کا واقع ہونا معلوم ہو۔ تا اسی سے یہ استدلال ہو سکے کہ جب نقصان ہو گیا ہے تو ضرور ہے کہ بعض حصص جن میں حضرت علیؓ کی فضیلت تھی نکال دیئے گئے ہوں٭ اور ممکن ہے کہ کسی جامع حدیث نے ایسی باتوں کو صرف اس پر محمول کر لیا ہو کہ یہ آیتیں منسوخ ہو چکی تھیں لیکن اس سے ان آیات کا قرآن شریف میں سے منسوخ ہونے یا فروگذاشت سے نہ لکھے جانے کا ثبوت نہیں ملتا +

ایسی سب حدیثیں صرف اکیلے آدمی کی شہادت بیان کرتی ہیں

اگر بالفرض محال ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ احادیث زیر بحث معتبر ہیں تو اس صورت میں ہم کو اسباب کا دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا کوئی شہادت ان کے متعارض اور مخالف تو موجود نہیں۔ کیونکہ اگر ایسی متعارض اور مخالف شہادت موجود ثابت ہو گی تو پھر اسباب کے جانچنے کی ضرورت ہو گی کہ دونوں میں سے کس طرف کی شہادت زیادہ قابل وثوق و اعتبار ہے اس موقعہ پر جب ہم دیکھتے ہیں تو ایک طرف تو اکیلے ابو موسے اشعری کی گواہی ہے کہ دو سورتیں صحابہ پڑھا کرتے تھے اور جس وقت اس نے یہ حال بیان کیا تو اس وقت اس کو یاد نہ رہی تھیں۔ اور دوسری طرف ساری جماعت صحابہ کبارؓ کی گواہی ہے کہ ان کے علم میں ہی کسی ایسی سورۃ کا وجود کبھی نہیں ہوا۔ جو جو لوگ قرآن خوان تھے اور جن جن کے پاس قرآن شریف موجود تھا ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس نے اتنا بھی کہا ہو کہ ہم نے ایسی دو سورتوں کی بابت سنا ہی تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ابوموسیٰ اشعری کی گواہی اتنی بڑی معتبر جماعت صحابہؓ کی شہادت کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔ اور خصوصاً جبکہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ اگر اس کا کچھ بھی وجود ہوتا تو کثیر جماعت کے علم میں اس کا آنا ضروری تھا۔ ایسی صورت میں اکیلے شخص کی گواہی کو تمام صحابیوں کی گواہی پر کوئی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ ترجیح کا سوال تو الگ رہا شمار اور موازنہ میں بھی نہیں لائی جا سکتی۔ البتہ اگر اس کے ساتھ بہت نہیں تو دو تین صحابہ ہی متفق ہوتے تو کسی منتقد کے دل میں شک پیدا ہونے کی وجہ ہو سکتی تھی لیکن یہ ایک ایسا دعوےٰ ہے جو صرف ایک معمولی درجہ کی خبر رکھنے والے صحابی کی شہادت پر مبنی ہے اور ہزارہا صحابہ رسول کریم صلعم جو اس سے زیادہ خبر اور دخل اور حافظہ رکھنے والے تھے اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس پر بھی اس کو پیش کرنا اور اس پر ناز کرنا پرلے درجہ کی نادانی اور نامعقولیت ہے یہی حال باقی ان حدیثوں کا ہے جو پیش کی جاتی ہیں۔ ایسی ہر ایک حدیث صرف ایک ہی شخص کی گواہی پر مبنی ہے جس کا کوئی دوسرا موید نہیں۔ اکیلے ابوموسیٰ اشعری ہی کی روایت پر بیان کیا جاتا ہے کہ دو سورتیں قرآن شریف کی گم ہو گئی تھیں۔ ان کے سوائے ایک بھی ایسا صحابی نہیں ہوا۔ جس نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی ہو۔ اور ان کے غلط خیال کی تائید کی ہو +

آیات قرآنی میں ایک آدمی کی شہادت وزن نہیں رکھتی

ایسے ہی حضرت عائشہؓ ایک آیت کا گم ہو جانا بیان کرتی ہیں لیکن وہ بھی اپنے بیان کی تائید میں ہزارہا صحابہ میں سے ایک گواہ بھی پیش نہیں کرتیں جہاں ابن مسعود ایک امر بیان کرتا ہے تو ابی اور دوسرے تمام صحابی اس کی تردید کرتے ہیں اور اگر ابی نے کوئی امر بیان کیا ہے تو ابن مسعود اور دوسرے سارے صحابہؓ اس کے مخالف ہیں۔ غرض جہاں کہیں اس قسم کی کوئی روایت آئی ہے وہ صرف ایک ہی شخص کا بیان ہے اور کوئی بھی دوسرا اس کے بیان کا موید اور گواہ نہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی شخص کی گواہی سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ جاتی کہ فلاں آیت قرآن شریف کی تھی کیونکہ

٭ محققین اہل تشیع قرآن کریم کی حفاظت کے قائل ہیں جیسا کہ آگے دکھایا گیا ہے +

یہ امر واقعہ ہے اور کثیر التعداد احادیث اس کی مصدق و مؤید ہیں کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت نازل ہوتے ہی عام طور پر شائع کردیجاتی تھی۔ اور قراء اور حفاظ اسکو فوراً یاد کرلیا کرتے تھے۔ جس حدیث میں زید کا بعہد خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ قرآن جمع کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے اخیر میں جو روایت لکھی ہے کہ سورہ براءۃ کی ایک آیت گم ہوگئی ہوئی تھی اور وہ صرف ابوخزیمہ کے پاس دستیاب ہوئی تھی اس روایت سے اس نتیجہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ وہاں صرف تحریر کا ذکر ہے۔ اور دوسری حدیثوں سے ثابت ہے کہ اسی زمانہ میں قرآن شریف کے بہت لوگ حافظ اور قاری موجود تھے جن کو سارا قرآن ازبر تھا اور جو ازبر تلاوت کیا کرتے تھے۔ الغرض کوئی معقول انسان اس بات پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا کہ صرف ایک شخص کی شہادت کو تمام جماعت کی شہادت کے مقابلہ میں ترجیح دے اور ان سب کو غلطی پر سمجھے +

تعامل اور تواتر قومی ان حدیثوں کو غلط ٹھیراتا ہے

پھر ان احادیث کی صحت پرکھنے کے لئے تیسرا معیار تواتر عملی یا تعامل ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے عاشق تھے کہ جو بات آپ کے مبارک دہن سے سنتے یا جو کام آپ کو کرتے دیکھتے یا آپ کے جو فرمان کانوں سے سن لیتے تو فوراً ان کو عمل میں لے آتے۔ اور اسطرح اُن سے ان کی اولاد اور توابع نے اور ان سے ان کی اولاد اور توابع نے لے کر عمل کیا اور نسلاً بعد نسلاً متواتر عمل کرتے چلے آئے ہیں یہاں تک کہ وہ سب کچھ ہم تک پہنچ گیا۔ اسکو تعامل کہتے ہیں جو باتیں تعامل میں آچکی تھیں احادیث کی کتابوں میں بھی لکھی جاتیں تو بھی کچھ حرج نہیں تھا۔ آنحضرت صلعم کے بعد سب سے زیادہ قیمتی چیز مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ہر ایک مسلمان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اس بیش بہا نعمت کو ہر قسم کی آمیزش اور تصرف سے محفوظ رکھ کر آیندہ نسلوں کو پہنچاتا رہے۔ اب اگر بفرضِ محال مان لیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تحکم سے بعض نسخے قرآن شریف کے معدوم کر دیئے۔ تو یہ امر دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا اکیلے حضرت عثمانؓ کا دخل اتنا بڑھا ہوا تھا اور ان کی طاقت ایسی وسیع ہوگئی ہوئی تھی کہ اتنی بڑی قوم کے قبضہ اور حافظہ سے ہر ایک آیت اور سورۃ مٹا سکیں۔ اور اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ ابن مسعودؓ جیسے مشہور لوگوں سے انہوں نے قرآن کے نسخے چھین لئے تھے تو یہ کیونکر سمجھا سکتا ہے کہ جو نقلیں عام طور پر ان لوگوں کے قرآنوں کی مسلمانوں میں مشتہر اور مروّج ہوچکی تھیں وہ بھی انہوں نے لوگوں سے لے لی تھیں؟ اور یہ ثابت شدہ بات ہے کہ قرآن کی بکثرت نقلیں اسی زمانہ میں مسلمانوں میں عام طور پر مروّج ہوچکی تھیں۔ اگر ان لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے نسخۂ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوتا تو وہ حق کے لئے ایسے دلیر تھے کہ فوراً اس کو عیاں کر دیتے اور کسی کے رعب و سیاست سے نہ دبتے لیکن بطور تنزّل اگر اتنا بھی مان لیا جائے کہ ان میں سے کسی مسلمان کو حضرت عثمانؓ کے نسخہ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوا تھا تو اتنا تو کوئی ضرور کرتا اور اس کے کرنے میں اسکو کوئی دقّت بھی نہ تھی کہ جو نسخہ صحیح اس کے اپنے پاس یا کسی اور کے پاس معلوم ہوتا اسکو حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں چھپا کر ہی محفوظ رکھ لیتا اگر کوئی ایسا کرتا تو حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کے ختم ہونے کے بعد ایسے قرآن کی نقلیں فوراً جا بجا

پھیلی تھیں۔ اور خصوصاً جب حضرت علی رض کا زمانہ آیا تھا تو چونکہ انہیں حضرت عثمان رض کے قرآن شریف کے مختلف نسخوں کو لیکر ایک مکمل نسخہ بنانے کی تدبیر کو اپنے زمانہ میں مروج رکھنے کی کوئی خاص غرض نہ تھی۔ اسلیئے ان کے زمانہ میں ایسا نسخہ قرآن شریف کا بہت آسانی اور عمدگی کے ساتھ وسیع اشاعت بلا تکلف حاصل کر سکتا تھا۔ اس طرح حضرت علی رض کے زمانہ میں بہت سارے ایسے قرآنوں کے نسخے مروج ہو جاتے۔ اگر انہیں حضرت عثمان کے جمع کردہ نسخہ سے ذرہ بھی اختلاف ہوتا اور اسکی اشاعت ورواج کو روکنے کی جرأت اپنے میں نہ پاتے تو اتنا تو ضرور ہوتا کہ دوسرے جس کسی نسخہ قرآن کو اس نسخہ سے زیادہ اچھا سمجھتے اسکو ہی شائع کرتے۔ لیکن حضرت عثمان رض نے ایسی احتیاط اور امانت سے کامل قرآن شریف نقل کرایا تھا۔ کہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اسکی صحت پر صاد تھا۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ تمام صحابہ رض کا متفق طور پر لکھا ہوا قرآن تھا۔ یہ ایسا مقبول کام تھا۔ کہ وہ لوگ جو حضرت عثمان رض سے ایسے ناراض ہوئے تھے اور ان میں آتش غضب ان کے برخلاف اس حد تک بھڑک اٹھی تھی۔ کہ امیر المومنین رض کے خون میں ہاتھ رنگ لیئے تھے ان لوگوں نے بھی اس قرآن میں کوئی نقص نہ پایا اور نہ بیان کیا۔ اور نہ ہی انہوں نے اس سے کوئی جدا نسخہ قرآن پیش کیا اور نہ ہی کسی سورۃ تو کیا ایک آیت کی کمی بیشی ہی بیان کی۔ بلکہ یہانتک کہ انہوں نے باوجود اس قدر حرف گیری کے اتنا بھی اشارہ نہ کیا کہ کوئی ایک لفظ بلکہ حرف ہی حضرت عثمان رض نے بدلا ہے۔ غور کی جگہ ہے کہ جب حضرت عثمان کی طاقت کا خاتمہ ہوگیا یعنی جب وہ باغیوں کے ہاتھوں سے مقتول ہو گئے۔ تو پھر جن حصص قرآن کو حضرت عثمان نے دبا رکھا تھا اور شائع نہ کیا تھا انکے شائع کرنے میں کونسی رکاوٹ کسی کو مانع ہو سکتی تھی اگر یہ بھی مانا جائے کہ حضرت عثمان کی سیاست ایسی غالب آئی تھی کہ انہوں نے تمام ایسے نسخے چھنوا کر ضائع کر دیئے تھے تو ان کی شہادت کے بعد ابھی بہت سارے قراء اور حفاظ زندہ تھے جن کے دلوں کی الواح پر قرآن شریف کا حرف حرف زمانۂ نزول سے ہی منقش اور منضبط تھا۔ ان کو حضرت عثمان رض مٹانے پر کیسے قادر ہو سکتے تھے۔ ان کا تو کسی فانی ہاتھ کی کوشش سے محو ہونا ناممکن محض تھا۔ قرآن شریف کے تمام ایسے حصے جن کے دبا رکھنے کا الزام حضرت عثمان پر بیجا اعتراض کرنے والے لگاتے ہیں وہ سب کے سب حضرت عثمان کی شہادت کے ساتھ ہی رواج عام میں آ جاتے اور قرآن میں شامل کر دیئے جاتے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تاریخ اس گواہی کیلئے طیار ہے کہ کسی اس قسم کی بات کا پتہ دیوے ہ سچی بات تو یہ ہے کہ تاریخ میں ہرگز ہرگز اس کا کوئی سراغ نہیں چلتا باوجودیکہ مسلمانوں کو اسی ابتدائی زمانہ میں ہی باہمی اختلاف نے علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔ اور اسکے بعد طرح طرح کے اختلافات ان میں پیدا ہوتے گئے لیکن باوجود ان سب اختلافات کے مختلف لوگوں اور مختلف فرقوں میں صرف یہی ایک قرآن جو حضرت عثمان رض نے لکھوایا تھا بلا کسی قسم کے اختلاف کے ہمیشہ سے مُرّوج اور مسلم چلا آیا ہے۔ اگر واقع میں کوئی اختلاف موجود ہوتا تو ضرور تھا کہ قرآن شریف کے نسخوں میں کسی نہ کسی طرح اسکو دخل ہو جاتا۔ لیکن تمام مسلمان جن میں بعض ایک دوسرے کے خونی دشمن بھی ہوتے رہے ہیں اور تمام اسلامی فرقے جو بعض بعض کے خون آشام حریف ہیں صرف ایک ہی قرآن شریف ہمیشہ سے مانتے چلے آتے ہیں۔ اس جمہوری اتفاق سے یہ امر پایۂ ثبوت کو زیادہ وضاحت سے پہنچتا ہے کہ اس قرآن کریم

میں کسی شخص کو کسی طرح کا اختلاف نہ تھا۔ اور یہ کہ یہی قرآن شریف ہے جو آنحضرت صلعم کے منشا کے موافق جمع کیا گیا تھا +

بعض شیعوں کا اعتراض اور میور کا جواب

بعض شیعہ لوگ اس بارہ میں کسی وقت طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اُن کے لئے ہم میور صاحب کی "لائف آف محمد" سے چند فقرات اقتباس کرنے پر کفایت کرتے ہیں۔ اس شخص نے خود ہی اعتراض اُٹھایا ہے۔ اور آپ ہی اُس کا جواب دیا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے۔ اس بات کو تسلیم کر کے کہ ہمارے ہاتھوں میں بلا تغیر و تبدل وہی نسخہ موجود ہے جو حضرت عثمان رضؓ نے شائع کرایا تھا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ نسخہ قرآن شریف کا زیدؓ والے قرآن شریف کے ساتھ سوائے خفیف اصلاحات کے بالکل مطابق ہے؟ اس بات کے ماننے کے لئے پورے پورے دلائل موجود ہیں کہ واقع میں ایسا ہی ہے۔ کسی پُرانی روایت اور معتبر حدیث سے ذرہ بھر بھی شک کرنے کی وجہ پیدا نہیں ہوتی کہ حضرت عثمان رضؓ نے اپنے دعوے کی تائید میں قرآن شریف میں ایک ذرہ بھر تصرف کیا ہو۔ اسمیں شک نہیں کہ متاخرین شیعوں نے غلطی سے یہ بات گھڑ رکھی ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے بعض سُورتیں اور بعض آیتیں عمداً درج قرآن نہ کرنے دی تھیں۔ اور وہ سُورتیں اور آیتیں ایسی تھیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دعاوی کی موید تھیں۔ لیکن شیعوں کی یہ بات بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ جب حضرت عثمان رضؓ کا نسخہ قرآن طیار ہوا تو حضرت علی رضؓ کے پیرووں اور بنو اُمیہ میں کوئی ظاہری اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اخوت و وحدت اسلامی میں کوئی فرق واقع نہ ہوا تھا۔ حضرت علی رضؓ کے دعوے ابھی تک منصۂ ظہور میں آئے ہی نہ تھے۔ کوئی ایسی غرض کافی طور پر نظر نہیں آتی۔ کہ جس نے ایسے وقت میں حضرت عثمان رضؓ کو ایسے مکروہ اور سیاہ جُرم کے ارتکاب پر آمادہ کر دیا ہو جو مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ تاریک گُناہ ہے۔ پھر ماسوا اس کے جب حضرت عثمان رضؓ نے قرآن جمع کر کے اس کو مستند طور پر شائع کیا تھا۔ تو وہ ایسا وقت تھا۔ کہ جبکہ ابھی ہزارہا ایسے لوگ زندہ موجود تھے جنہوں نے وقت نزول سے ہی قرآن شریف کو سنکر حفظ کر لیا ہُوا تھا۔ اور اگر کوئی سُورۃ یا آیت ایسی ہی تھی جو حضرت علی رضؓ کے دعوے کے موید تھی تو ضرور تھا کہ وہ ہزارہا لوگوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتی جو حضرت علی رضؓ کے ساتھ خاص خلاص اور تعلق رکھتے تھے۔ یہ دونوں ایسی باتیں تھیں کہ ان سے اصل قرآن میں کسی قسم کے تصرف و تغیر کا دخل پانا ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر اس کے علاوہ حضرت عثمان رضؓ کے فوت ہوتے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خیر خواہوں کی جماعت کا غلبہ ہو گیا اور ایسی آزاد طاقت حاصل کر لی کہ انکو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیا یہ گمان صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اس طرح ان کو قوت اور دولت ملگئی تھی تو اس وقت وہ اسی ناقص قرآن شریف کے رواج کی اجازت دے رکھتے؟ اور ناقص بھی ایسا کہ ان کے اپنے پیشوا حضرت علی رضؓ ہی کے دعووں کی آیات اور سُور کے اندراج سے ناقص لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ وہ لوگ بھی اسی قرآن کو بلاقیل و قال ہمیشہ استعمال کرتے رہے۔ اور اُن کے مخالف بھی اسی قرآن کو پڑھتے رہے۔ اور خفیف سے خفیف اعتراض بھی اس کے خلاف نہیں کیا" +

اس جگہ یہ بات بھی ذکر کر دینے کے قابل ہے کہ شیعوں کی ساری جماعت ہی ایسا اعتقاد نہیں رکھتی کہ قرآن شریف

محققین اہل تشیع حفاظت قرآن کے قائل ہیں

کے کچھ حصے کم ہو گئے تھے یا وہ سورتیں جو حضرت علیؓ کے دعووں کی مؤید تھیں ان کو حضرت عثمانؓ یا زیدؓ نے عمداً چھوڑ دیا تھا۔ ان لوگوں میں بھی زیادہ ایسے ہوئے ہیں اور ہیں جو مانتے ہیں کہ قرآن شریف ہر قسم کی آلائش اور تصرف سے پاک ہے۔ اور یہی قرآن شریف جو بین الدفتین دنیا میں موجود ہے زمانہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور زمانہ صحابہؓ اور زمانہ تابعین میں تھا۔ اور یہی بلا تغیر و تبدل حرف و حرکت موجود ہے یہی اعتقاد بڑے بڑے فضلاء اور محققین اہل تشیع کا ہے۔ البتہ جاہل لوگ ایسا اعتقاد رکھتے ہیں کہ بعض حصص قرآن شریف گم ہو گئے ہوئے ہیں چنانچہ ہم تفسیر صافی میں سے جو اہل شیعہ کی ایک بڑی معتبر تفسیر ہے۔ اور آج کل ان کے مدارس میں بطور درس داخل ہے چند فضلائے اہل تشیع کے آراء لکھتے ہیں۔ جو انہوں نے اس قرآن شریف کی نسبت جو آج کل دنیا میں رائج ہے ظاہر فرمائی ہیں۔ چنانچہ اس تفسیر میں ملا محسن جاہل شیعوں کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے فقد روی جماعۃ من اصحابنا وقوم من حشویۃ العامۃ ان فی القرآن تغییراً و نقصاناً والصحیح من مذھب اصحابنا خلافہ وبلغت حد الم نبلغہ فیما ذکرناہ لان القرآن معجزۃ النبوۃ وماخذ العلوم الشرعیۃ والاحکام الدینیۃ وعلماء المسلمین قد بلغوا فی حفظہ و حمایتہ الغایۃ حتی عرفوا کل شئ اختلف فیہ من اعرابہ وقرأتہ وحروفہ وآیاتہ فکیف یجوز ان یکون مغیراً او منقوصاً مع العنایۃ الصادقۃ والضبط الشدید یعنی ہمارے دوستوں کی ایک جماعت اور عوام حشویہ نے یہ روایت کی ہے کہ قرآن شریف میں تغیر اور نقصان ہے اور ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب اسکے خلاف ہے۔ اور نیز ان لوگوں کی رائے اس حد تک پہنچی ہے کہ ہم اسکو بیان نہیں کر سکتے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ قرآن نبوت کا اعجاز اور علوم شرعیہ اور دینی احکام کا ماخذ ہے اور علمائے اسلام نے یہانتک اسکی حفاظت اور حمایت کی ہے کہ انہوں نے ہر چیز پر جس میں اعراب و قرأت اور حروف اور آیات کے بارہ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ عرفان تام اور واقفیت عام پیدا کر لی ہے پھر کیونکر ممکن ہے کہ ایسے ضبط شدید اور حفاظت صحیحہ کی موجودگی میں کسی قسم کا تغیر یا کمی ہونے پائی ہو۔ (دیکھو تفسیر صافی مصنفہ ملا محسن صفحہ ۱۴) پھر آگے چلکر مصنف مذکور اسی صفحہ پر لکھتا ہے ان القرآن علی عھد رسول اللہ مجموعاً مولفاً علی ما ھو علیہ الان واستدل علی ذلک بان القرآن کان یدرس ویحفظ جمیعہ فی ذلک الزمان حتی عین علی جماعۃ من الصحابۃ فی حفظھم لہ وانہ کان یعرض علی النبی ویتلی علیہ وان جماعۃ من الصحابۃ مثل عبد اللہ بن مسعود وابی بن کعب وغیرھما ختموا القرآن علی النبی عدۃ ختمات وکل ذلک یدل بادنی تامل علی انہ کان مجموعاً غیر مبتور ومبثوث وذکر ان من خالفہ فی ذلک من الامامیۃ والحشویۃ لا یعتد بخلافھم فان خلاف فی ذلک مضاف الی قوم من اصحاب الحدیث نقلوا اخباراً ضعیفۃ یعنی یہی قرآن رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں اسی طرح جمع شدہ اور اکٹھا تھا جس طرح کہ اب ہے۔ اور اس پر یہ دلیل ہے کہ قرآن حمید مکمل و مجموعی طور پر اس زمانہ مبارک میں پڑھا جاتا اور حفظ کیا جاتا تھا۔ اور

صحابہؓ کی ایک جماعت مثل عبداللہ و اُبی بن کعب وغیرہ نے چند مرتبہ قرآن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ختم کیا۔ اور ان باتوں پر ادنےٰ تامل و تفکر سے نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مرتب مدون تھا۔ منتشر نہیں تھا۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امامیہ یا حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس رائے کی مخالفت کی ہے اُن کی اس کے مقابل میں کوئی حقیقت اور شمار نہیں ہے کیونکہ یہ خلاف صرف اصحاب حدیث سے ہوا ہے جنہوں نے ضعیف خبریں نقل کر دی تھیں +

مابین الدفتین کے اصلی ہونے پر اجماع

پھر مفسر مذکور اپنی تفسیر میں بہت سارے بڑے بڑے مسلّم اور مستند علما و فضلا و محدثین امامیہ کے اعتقاد کا اقتباس کرتا ہے۔ یہ جن کی عظمت اور لیاقت کی شہرت کا سکّہ تمام شیعہ دنیا میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے بہت سارے حوالے ایسے نقل کیے ہیں جن میں یہ لوگ صاف اور کھلے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قرآن جو بین الدفتین مسلمانوں میں رائج ہے یہ ٹھیک وہی قرآن ہے جو اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جو امامیہ فرقہ میں بہت مستند اور مسلم حدیث ہے۔ اور جس کے اسناد پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ یہ حدیث بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے کہ یہی قرآن شریف جو دنیا میں عام طور سے مروج ہے لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً وہی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوا تھا اور جس طرح آپ نے ترتیب دلائی تھی اور اس میں کسی تبدّل و تغیر کو کسی طرح سے دخل نہیں ہوا +

اِن مذکورہ بالا حوالوں سے کافی طور پر ثابت ہے کہ علمائے محققین فرقۂ امامیہ کو بھی مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے علماء کے ساتھ اس بات میں اتفاق ہے کہ یہ قرآن شریف جو بین الدفتین مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے ٹھیک وہی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوا تھا۔ اور کہ اس میں کسی قسم کی دسترس کسی غیر کی نہ اسکی ترتیب میں نہ آیت و لفظ و حرف میں بلکہ کسی حرکت کے بدلنے میں بھی ہو سکی۔ اگر یہ نادان معترض قرآن شریف کے اس اعجاز کی طرف نظر غور اُٹھا کر دیکھتے کہ جبکہ حضرت عثمانؓ کا شائع کردہ قرآن آج تک دنیا میں اس قدر وسیع طور سے مروّج اور شائع ہو چکا ہے۔ اور اسلامی اقوام اس قدر دُور دُور پھیل گئی ہیں مگر مختلف ممالک میں رہتے اور مختلف زبانوں کے بولنے کے باوجود جہاں کہیں جاؤ تیرہ سو برس سے وہی قرآن موجود ہے! اور اس میں کسی قسم کا اختلاف اور تغیر واقع نہیں ہو سکا۔ تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ صرف تیرہ برس کے ایسے پاک زمانہ ہی میں اس میں کسی کی دستبرد کو راہ ملجاتی۔ وہ تو ایسا زمانہ تھا کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد صرف تیرہ سال ہی گذرے تھے اور مسلمانوں میں وحدت موجود تھی۔ اور ایک مُلک اور قریباً ایک ہی زبان کے سمجھنے والے تھے۔ اور ان میں کثیر التعداد ایسے قراء و حفاظ موجود تھے جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر قرآن حفظ کیا ہوا تھا۔ اور تازہ تازہ زمانہ تھا! ور اسکے بعد ہمارے زمانہ تک مختلف قوموں میں ہزارہا اختلافات واقع ہوئے۔ ہزارہا قومیں مختلف مُلکوں میں رہنے والی اور مختلف بانیں بولنے والی اسلام میں داخل ہو گئیں۔ پھر جبکہ اس تیرہ سو برس کے لمبے زمانہ میں ایک حرکت بھی بدل نہیں سکی تو اس پہلے زمانہ کی نسبت کسی تبدیلی یا فروگذاشت کا خیال کرنا ہی سراسر حق کا خون کرنا ہے۔ وہ ابتدائی زمانہ ایسا تھا کہ جسمیں

وہ اسباب جن سے قرآن شریف ہر آلائش اور تصرف سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا بہت کثرت سے موجود تھے صحابہ رسول کریم صلعم اور تمام متقدمین اس بات کو علی وجہ البصیرت مانتے اور جانتے تھے کہ قرآن شریف میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوا۔ امام بخاری نے ایک حدیث لکھی ہے۔ اور یہ ایسی حدیث ہے کہ جس کی صحت پر کبھی کوئی جرح واقع نہیں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ جب ابن عباس اور محمد بن حنفیہ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلعم نے کیا چھوڑا ہے تو دونوں نے متفق اللفظ ہو کر جواب دیا کہ ماترک الا مابین الدفتین" یعنی آپ نے وہی کچھ چھوڑا ہے جو بین الدفتین موجود ہے"۔ واضح رہے کہ بین الدفتین کی اصطلاح وہ ہے جو اس قرآن شریف کے لئے پہلے بولی گئی تھی جو حضرت عثمان نے شائع کیا تھا۔ کا مطلب یہ تھا کہ یہی قرآن جو حضرت عثمان رضؓ نے شائع کیا ہے آنحضرت صلعم نے پیچھے چھوڑا ہے +

ڈاکٹر منگانا کے تین قدیم قرآنوں کے اوراق

اب ہم ڈاکٹر منگانا کے دریافت کردہ نسخہ ہائے قرآنی کو لیتے ہیں۔ اصل مالکہ ان اوراق کی ایک لیڈی ہیں اور انہوں نے یہ اوراق اشیائے قدیم کے تاجروں سے ۱۸۹۵ء میں بمقام سویز خریدے تھے۔ ان اوراق پر پکے بعد دیگرے تین قدیم تحریریں ایک دوسری کے اوپر لکھی ہوئی تھیں۔ اور سب سے نیچے قرآن کریم کی کچھ عبارتیں تھیں۔ مگر جب اسکے بعد دوسری عبارت انہی اوراق پر لکھی گئی تو پہلی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ رگڑ کر محو کر دیا گیا۔ پھر مرور زمانہ سے وہ پہلی تحریر کچھ دھیمی سی نظر آنے لگی۔ ہوتے ہوتے یہ اوراق ڈاکٹر منگانا کی نظر کے نیچے آگئے جو اپنی لیڈی دوست کے مہمان تھے۔ اور انہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اس محو شدہ تحریر کو پڑھ کر ان اوراق کی عبارات قرآنی کو ۱۹۱۴ء میں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ جس کا نام انہوں نے لیوز فرام تھری انشنٹ قرآنز یعنی تین قدیم قرآنوں کے اوراق رکھا۔ اور یہ دعویٰ کیا۔ کہ ان اوراق سے قرآن کریم کے معتمد نسخہ میں جو آج ساری اسلامی دنیا میں مروج ہے۔ اور دیگر نسخہ جات میں جو پہلے کسی زمانہ میں مروج تھے اختلاف ثابت ہوتا ہے ڈاکٹر منگانا کی لیڈی دوست جو ان اوراق کی اصل مالکہ ہے بڑی جرات سے اسبات کا بھی اعلان کرتی ہے کہ یہ اوراق اُن نسخہ جات کے اوراق ہیں جو حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ سے پہلے مروج تھے اور جن کو حضرت عثمان رضؓ نے خود چار یا پانچ مستند نسخے تیار کرانے کے بعد جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ تاکہ آئندہ جس قدر نسخہ جات قرآنی تیار ہوں وہ ان مستند نسخوں کی نقلیں ہوں۔ ڈاکٹر اگنس سمتھ لوئیس کا جو اُن اوراق کی مالکہ کا نام ہے۔ یہ خیال ہے کہ یہ اوراق حضرت عثمان رضؓ کے ہاتھ نہیں لگے اور ان کے مالک نے قرآن کریم کی عبارات کو چمڑے کے کاغذوں پر سے مٹا کر کاغذات کو فروخت کر دیا۔ حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ کے بعد کے یہ کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ ڈاکٹر لوئیس کو سوائے اسکے کوئی نہیں مل سکی کہ اس قسم کی عبارات کا حضرت عثمان رضؓ کے وقت کے بعد لکھا جانا ایک بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر ان کا دوست ڈاکٹر منگانا اس بارہ میں زیادہ محتاط ثابت ہوا ہے۔ وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ ان مسودات کے بعض حصص کا آٹھویں صدی کے ابتدا کا ہونا (جو حضرت عثمان رضؓ کے بہت بعد کا زمانہ ہے) اغلب ہے وہ ان کو حضرت عثمان رضؓ سے پہلے کے لکھے ہوئے قبول کرنے کے لئے کسی صورت میں تیار نہیں۔ ہاں یہ کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ ان اوراق عثمانی سے جو جلنے سے کسی تدبیر سے بچائے گئے ہوں یہ اوراق نقل کئے گئے ہوں

مگر یہ بھی محض بطور ایک خیال کے پیش کیا گیا ہے اور کوئی قطعی فیصلہ اسبات پر دینے سے ڈاکٹر منگانا نے اپنے آپ کو روکا ہے +

ان اوراق میں ذیل کی عبارات یعنی سُورتوں کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ الاعراف ۱۳۹ - ۱۶۰ التوبہ ۱۸ - ۷۹ - ہود ۲۰ - ۳۹ - رعد ۱۸ - ۴۳ - ابراہیم ۱ - ۸ - الحجر ۸۵ - ۹۹ - النحل ۱ - ۴۱ و ۹۰ - ۱۲۸ - بنی اسرائیل ۱ - ۵۷ - النور ۱۷ - ۲۹ - القصص ۴۳ - ۵۱ - العنکبوت ۱۷ - ۳۰ - المومن ۷۸ - ۸۵ - حٰم فصلت ۱ - ۲۰ - الدخان ۳۸ - ۵۹ - الجاثیہ ۱ - ۲۰ - یہ حصص سارے کے سارے ایک ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ ڈاکٹر منگانا کی رائے میں چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں - اور ان کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات کا بھی کچھ ذکر کیا گیا ہے - ایک مشترک خصوصیت سب کی یہ ہے کہ ان میں حرف ہمزہ نہیں پایا جاتا - کُل اختلافات کو جو ان اوراق میں مستند نسخہ سے جو اسلامی دنیا میں مروج ہے پائے جاتے ہیں ڈاکٹر منگانا نے تین حصوں پر تقسیم کیا ہے پہلا حصہ وہ ہے جس میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ اختیار کیا گیا ہے دوسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی چھوٹا سا اختلاف و کا ہونا یا نہ ہونا - و کی بجائے ف یا ف کی بجائے و کا ہونا یا اس قسم کے اختلاف دکھائے گئے ہیں تیسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی لفظ زائد پایا جاتا ہے یا کوئی لفظ کم پایا جاتا ہے حصہ اول میں چار اختلاف حصہ دوئم میں تیس اور حصہ سوئم میں چار اختلافات دکھائے گئے ہیں۔ اسلیئے سب سے پہلے میں حصہ دوئم کو لیتا ہوں جس میں اختلافات کی تعداد زیادہ دکھائی گئی ہے +

کاتبوں کی غلطیاں

قبل اس کے کہ ان اختلافات پر بحث کی جائے ان کُل اختلافات کے متعلق میں چند الفاظ یکجائی طور پر کہنا چاہتا ہوں - ان میں سے امر اوّل یہ ہے کہ قرآن کریم کے مختلف مسودات میں اختلافات دکھانے کیلئے صرف اس قدر دکھانا کافی نہیں کہ ایک مسودہ میں ایک لفظ اور طرح پر لکھا ہوا ہے - اگر اس سے اختلاف ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اشیائے قدیم کے تاجروں سے چند اوراق خریدنے اور ان پر محنت اور ذہانت صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - اس قسم کے اختلافات آج چھپے ہوئے نسخہ جات قرآنی میں بھی دکھائے جا سکتے ہیں - جو کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہیں ہم یہ نہیں مانتے کہ پچھلے زمانہ کے کاتب فرشتے تھے - وہ بھی انسان تھے - بلکہ ذرائع علم و مقابلہ چونکہ اس قسم کے موجود نہ تھے جیسے ہمارے زمانہ میں ہیں۔ اسلیئے ان سے غلطی کا ہو جانا اور پھر اس کا درست نہ ہو سکنا اور بھی زیادہ قرین قیاس ہے یہی تو وہ بات تھی جس کی اصلاح کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ نے مختلف مسودات کو جو لوگوں نے اپنے اپنے طور پر رکھے ہوئے تھے جلوا دیا - کیونکہ ان لکھنے والوں سے کافی اہتمام درستی کا نہ ہو سکتا تھا - اسلئے آپ نے چار یا پانچ بڑے بڑے مرکزوں میں مستند نسخے قرآن شریف کے رکھوا دیئے - تا وہاں آسانی سے مقابلہ ہو کر صحیح نسخہ جات عالم اسلامی میں شائع ہوں - تعجب ہے کہ اس امر پر جو ایک اعلےٰ درجہ کی دُور اندیشی پر مبنی تھا آج حضرت عثمانؓ پر حرف رکھا جاتا ہے - وہ زمانہ چھاپے خانوں کا تو تھا نہیں کہ ایک سرکاری ایڈیشن شائع کر دیا جاتی اور اسکی کاپیاں کُل اطراف عالم میں پہنچا دی جاتیں صحت کا اہتمام جو کچھ ہو سکتا تھا وہ یہی تھا کہ بڑے بڑے مرکزوں

میں صحیح نسخہ جات موجود ہوں اور ان کے ساتھ لوگ مقابلہ کرلیں پس اگر کسی نسخہ میں کوئی فرق پایا جاتا ہے تو اس سے نتیجہ نکالنا کہ یہ اختلاف قرآن میں ہے۔ ایک احمقانہ حرکت ہے۔ اختلاف دکھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے کم سے کم تین نسخجات دکھائے جائیں جن میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ ہے یا کوئی لفظ دوسری طرح پر لکھا گیا ہے یا کسی لفظ کی کمی بیشی ہے۔ مثلاً ایک کاتب دَمن کی جگہ ثمن لکھ دیتا ہے تو یہ اِسبات کا ثبوت نہیں کہ قرآن کریم میں جو دمن لکھا ہے وہ غلط ہے بلکہ اس کا ثمن لکھنا اسکی غلطی ہوگی۔ ہاں اگر کم سے کم تین مختلف کاتب دکھائے جائیں جنہوں نے ایک دوسرے سے یا ایک ہی نسخہ سے نقل نہ کیا ہو۔ اور وہ تینوں ایک خاص موقع پر دمن کی بجائے ثمن لکھتے ہوں تو سمجھا جائیگا کہ یہ ایک اختلاف ہے پس سب سے اوّل اِس اصول کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ ایک کاتب کے ایک لفظ کو دوسری طرح لکھ دینے سے صرف یہی ثابت ہوگا۔ کہ اس سے غلطی ہوگئی۔ اور اس سے قرآن کریم میں کوئی اختلاف ثابت نہیں ہوتا +

مسودات منگانا کے متعلق قیاسات

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ نسخہ جسے پیش کیا گیا ہے وہ کیا چیز ہے۔ وہ کوئی پرانی تحریر اس قسم کی نہیں جس کے متعلق یقین سے یہ کہا جاسکے کہ اُسے کس نے لکھا اور کب لکھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی عیسائی نے چند الفاظ میں تغیر و تبدل کرکے اس کو مسلمانوں میں شائع کرنے کی کوشش کی ہو اور کسی مسلمان کے ہاتھ آنے پر اس نے اس تحریر کو بوجہ ان غلطیوں کے ہی محو کر دیا ہو یا خود اس عیسائی نے ہی اپنے آپ کو ناکام پاکر پھر ان حروف کو مٹا دیا ہو۔ ابتدائی زمانہ کے بعض عیسائی بزرگوں نے تو دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو بھی جائز رکھا۔ اور پھر جب خود کئی وضعی اناجیل بن سکتی ہیں جن کا وضعی ہونا عیسائی دُنیا کو مُسلّم ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ اسی طرح پر چند آیات قرآنی میں بھی تغیر و تبدل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ مگر چونکہ اللہ تعالےٰ کا اپنا وعدہ اِس کلام اِلٰہی کی حفاظت کا تھا اسلیئے اللہ تعالےٰ نے ایسی کوشش کرنے والے کو ناکام کیا ہو۔ اسبات سے کہ یہ صرف چند ٹکڑے چند سورتوں کے ہیں کوئی کہیں سے اور کوئی کہیں سے اور پھر چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں اِسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کوئی کامل جلد قرآن شریف کی نہیں ہے نہ پوری ایک سورت ہی ہے۔ تیسرا امر

مسودات منگانا کی حیثیت

ضروری یہ دیکھنا ہے کہ اس مسودہ کی حیثیت کیا ہے۔ اس پر پہلے عربی عبارت لکھی گئی۔ پھر جب کسی دوسری عبارت کے لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو اصل عربی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ چمڑے کے کاغذ کو رگڑ کر اس کاغذ کو صاف کیا گیا اور اس پر دوسری عبارت لکھی گئی۔ پھر اس پر کسی تیسرے زمانہ میں کوئی اور ہی عبارت لکھی گئی۔ سو اول تو اس قدر گڈمڈ میں اصل الفاظ کو پہچاننا ایک نہایت دشوار کام ہو جاتا ہے اور ہشیار سے ہشیار پڑھنے والے کو بھی غلطی لگ سکتی ہے چہ جائیکہ ایک مخالف گواہ کے ہاتھ میں ایسے مسودہ کو دیکر سارا اعتبار شہادت کا اِسی پر رکھا جائے کہ جو کچھ وہ کہدے وہ درست ہے۔ یہ کوئی قدیم زمانہ کی صفائی سے لکھی ہوئی تحریر نہیں کہ اسکو آسانی سے پڑھا جاسکے اور اس میں کسی قسم کا شُبہ واقع نہ ہو سکے۔ پھر پتھر سے رگڑنے میں یہ ظاہر ہے کہ بعض حروف کی سیاہی پھیل گئی ہو اور ایک حرف کے نقطوں نے اصل حرف کے ساتھ ملکر کوئی اور ہی شکل اختیار کرلی ہو۔ یا بعض حصص ایسے اُڑ گئے

ہوں کہ وہ دوبارہ نمودار ہونے کے قابل ہی رہے ہوں چنانچہ کئی سطروں کے کئی حصے اِس طرح پر محو شدہ ان عبارات کے اندر موجود ہیں مثلاً صفحہ ۶ پر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۹ و ۱۶۰۔ ڈاکٹر منگانا کے نسخہ میں یوں لکھے ہوئے ہیں۔ ومن قوم موسی امـة یھدون بالـ.. وبه یعدلون قطع.. هم... اسباط... امما واوحینا الی موسیٰ اذ استسق.. قومه ان اضرب بعصاك۔ اس کے بعد سارے الفاظ محو ہیں۔ اب اصل عبارت یوں ہے۔ ومن قوم موسیٰ امه یھدون بالحق وبه یعدلون ۝ وقطعنٰهم اثنتی عشرة اسباطا امما واوحینا الی موسیٰ اذ استسقٰه قومه ان اضرب بعصاك.....۱۲ ان چند الفاظ میں بالحق کا صرف با پڑھا جاتا ہے باقی محو ہو گیا ہے قطعنٰهم میں سے پہلا اور پچھلا حصہ موجود ہیں درمیانی حصہ محو ہے۔ اسباطاً کا آخری الف محو ہے استسقه میں آخری حرف محو ہے اور قطعنٰهم کے پہلے جو و ہے وہ محو ہے اب یہ کہنا بجا ہوگا کہ اِس نسخہ کے لکھنے والے کو اصل قرآن سے اختلاف ہے کہ وہاں قطعنٰهم کے پہلے و ہے اس نسخہ میں نہیں بلکہ جس طرح دوسرے الفاظ کے بعض حصص بالکل محو ہو گئے یہ بھی محو ہو گیا۔ ایسی مثالیں کثرت سے انہی اوراق سے دیکھا سکتی ہیں مگر ہماری غرض کیلئے یہ ایک مثال بھی کافی ہے۔ اسطرح جب کاغذ صاف کر کے دوسری عبارت لکھی گئی تو بالکل قرین قیاس ہے کہ اس دوسری عبارت کے بعض شوشے یا نقطے (کیونکہ اس میں بھی نقطے ہیں) پہلے پھیکی سیاہی کے ساتھ مخلوط ہو کر کوئی اَور شکل اختیار کر چکے ہوں۔ غرض ایک عبارت کو پتھر سے رگڑ کر محو کرنے میں پھر اس پر دوسری عبارت لکھنے میں کئی قسم کے تغیر آجانا قرین قیاس ہے۔ اسلئے ایسا مسودہ قرآن کریم کے مُستند نسخہ کے خلاف جس پر تحریر اور حافظہ کُل اسلامی دُنیا کا متفق ہو بطور شہادت پیش کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں +

پڑھنے والوں کا تعصب

چوتھی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اس مسودہ کے جو ایسی گڈ مڈ حالت میں ہے پڑھنے والے کون ہیں۔ ایک ڈاکٹر منگانا اور دو ان کی دوست لیڈیاں۔ جو تینوں کے تینوں بوجہ ان خیالات کے جو اسلام کے خلاف انکے دلوں میں بچپن سے جاگزین ہیں۔ ایک اُئی کا پہاڑ بنانے کو تیار ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظر منقدانہ کہاں ہو سکتی ہے۔ چاہیئے تھا کہ کوئی نے لوث شہادت اپنے اس پڑھنے پر پیش کیجاتی۔ اس کی میں ابھی مثالیں دونگا۔ کہ کس طرح پر تعصب نے ان کی نظر کو وہ کام کرنے سے روکا ہے جو ایک منصف کی نگاہ آسانی سے کر سکتی تھی۔ پس جو نسخہ پیش کیا جاتا ہے۔ نہ اس کے لکھنے والے کی شہادت قابل اعتبار۔ نہ خود نسخہ ایسا کہ اسکی بنا پر کسی عدالت میں شہادت قابل اعتبار سمجھی جائے نہ اس نسخہ کا پڑھنے والا ایسا جو نے تعصب ہو کر شہادت دے سکے۔ اِس قدر مشکلات کے اندر اس نسخہ کو قرآن کریم میں اختلافات کی شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک مجنون کی بڑ سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتا +

ان مسودات کے اختلافات اختلافات قرآت میں سے نہیں

ایک اَور بات جو ان اختلافات پر روشنی ڈالتی ہے یہ ہے۔ کہ جس قدر اختلافات ڈاکٹر منگانا نے دکھائے ہیں وہ ان قرآتوں میں سے نہیں جن کا تحریر میں لانا حضرت عثمان نے منع کر دیا تھا۔ اور جس روک کے لئے اُنہوں نے مُستند نسخوں کے علاوہ دوسرے نسخے جلا دیئے تھے۔ ایک ہی بات تھی جو ڈاکٹر منگانا کی اس دریافت

کو کچھ وقعت کے قابل ٹھیرا سکتی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس نسخہ میں کچھ مختلف قرأتیں پائی جاتیں جن کی اجازت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دی تھی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نسخہ کے اختلافات مزعومہ ان مختلف قرأتوں میں سے ایک کو بھی اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اور اس موقعہ پر بھی وہی بات کہنی پڑتی ہے جس کو میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جو حملہ قرآن کریم کی حفاظت پر کیا گیا ہے اس کی تردید خود دوسرے معترض ہی کر دیتے ہیں۔ اگر یہ نسخہ حضرت عثمانؓ سے پہلے کا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس میں ان مختلف قرأتوں میں سے کوئی قرات نہیں پائی جاتی جن کا اس وقت رواج تھا ۔

ان مسودات کے کاتبوں کی ناواقفیت

جن ہاتھوں نے یہ نسخے لکھے ہیں ان کے متعلق بھی چند الفاظ ضروری ہیں۔ اصل مسودات تو ہمارے سامنے نہیں ہیں اور جو دو صفحات نمونہ کے دیئے گئے ہیں ان سے کافی طور پر اصل تحریر پر روشنی نہیں پڑتی لیکن جس طرح ڈاکٹر منگانا نے ان کو پڑھ کر ہمارے سامنے رکھا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے کس قدر ناواقف ضرور ہیں۔ ڈاکٹر منگانا نے بعض باتوں کو اس وقت کی خصوصیات میں داخل کیا ہے مثلاً شیٔ کی جگہ شای کا لکھنا یا یوحی کی جگہ یوحا لکھنا یا انما کی جگہ ان ما لکھنا ۔ قران کی جگہ قرن لکھنا یبلوا کی جگہ نبلوا لکھنا اذا انا کی جگہ اذنا لکھنا علم کی جگہ عیلم لکھنا مگر یہی باتیں ناواقفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اول تو قرآن کریم کے لکھنے کی طرز ابتدا سے ایک ہی چلی آئی ہے۔ اور جو لفظ جس طرح پہلے کاتب نے لکھ دیا ہے اسی طرح آج تک قرآن شریف میں لکھا جاتا ہے مثلاً صلوٰۃ کو دو چار مقامات پر صلات۔ قال کو بعض جگہ قٰل پس کوئی باخبر کاتب ایسی غلطی نہ کر سکتا تھا۔ پھر یہاں معمولی اختلاف نہیں بلکہ صاف طور پر کاتب بے خبر نظر آتا ہے۔ ورنہ علم کو عیلم کوئی واقف کاتب نہ لکھ سکتا تھا۔ نہ قران کو قرن نہ یبلوا کو نبلوا وغیرہ۔ اسی طرح پر بعض وقت دو الفاظ کو جو مل نہیں سکتے ملا دیا ہے۔ مثلاً یوم الفصل کو یوملفصل۔ یهد یهم سبیلا کو یهدیهمسبیلا۔ هم بایتنا کو همبایتنا۔ ذلک الدین القیم فلا کے آخری حصہ میں القیم اور فلا کو ملا کر القیمفلا۔ لهم سوء اعمالهم کو لهمسواعمالهم۔ فیک سمعون کو فیکسمعون لکھ دیا ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح واتبعوه کو واتبعه لکھ دیا ہے۔ جنود کو جنا لکھ دیا ہے۔ یجادلو کو یجیدل لکھ دیا ہے۔ الصلوة کو الصیلوة لکھ دیا ہے۔ اسی قسم کی چند مثالیں اور بھی آ چکی ہیں جن کو ڈاکٹر منگانا نے اس وقت کی طرز تحریر کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ مثلاً علم کو عیلم لکھنا طرز تحریر نہیں۔ میں نے بطور نمونہ یہ صرف چند مثالیں دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ شاید اس وقت قرآن شریف میں یہ الفاظ اسی طرح لکھے جاتے ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن کریم کی طرز تحریر میں آج تک برابر پہلی طرز تحریر کا تتبع کیا جاتا ہے مثلاً کتاب کو کتٰب ہی لکھا جاتا ہے۔ سبحان کو سبحٰن اور اسی قسم کی صدہا مثالیں ہیں۔ بلکہ ایک لفظ جو ایک جگہ ایک طرز پر لکھا گیا ہے۔ اور دوسری جگہ دوسری طرز پر

تو اب تک اس کا برابر تتبع ہوتا ہے مثلاً صلوٰۃ کا لفظ قرآن کریم میں عموماً واو کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے۔ مگر سورۃ الانعام کے آخر میں صلاتی لکھا ہے صلوتی نہیں لکھا۔ حالانکہ ھود آیت ۸۹ میں صلوتك ہے صلاتك نہیں۔ اور الانعام ۹۳ میں صلاتھم ہے صلوتھم نہیں۔ اور النور ۴۱ میں صلاتہ ہے صلوتہ نہیں۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں ابراھیم کو ابرھم لکھا ہے لیکن دوسرے مقامات پر ابراھیم لکھا ہے یعنی یا کے ساتھ۔ قرآن کریم میں قال کا لفظ عموماً اسی طرح الف کے ساتھ لکھا ہے لیکن بعض موقعہ پر اس کو قل لکھا ہے۔ اور اب تک اس خاص موقعہ پر اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ اسی قسم کی بیسیوں مثالیں ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی طرز تحریر محفوظ چلی آتی ہے۔ اور اسی طرز تحریر کو چھوڑنا ناواقفیت کی علامت ہے۔ اسلئے یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ اگر ڈاکٹر منگانا نے اصل الفاظ کو پڑھنے میں کوئی تصرف نہیں کیا۔ اگر حروف کے رگڑنے میں سیاہی پھیل کر یا بعض شوشے یا نقطے بالکل محو ہو کر الفاظ کی صورت بدل نہیں گئی۔ اگر اوپر والی تحریروں سے کچھ غلط اصلی تحریر میں نہیں ہو گیا تو ان مسودات کے لکھنے والا کوئی ناواقف آدمی تھا +

قسم دوئم کے اختلافات

اب میں ان اختلافات کو الگ الگ لیتا ہوں۔ اور سب سے پہلے قسم دوئم کے اختلافات پر بحث کرتا ہوں جن کی تعداد ۳۰ بتائی گئی ہے۔ اس میں اول تو وہ الفاظ ہیں جن میں محض ڈاکٹر منگانا کو غلطی لگی ہے۔ بلکہ میں کہونگا کہ جن میں ڈاکٹر منگانا نے مغالطہ دینے کی کوشش عمداً کی ہے مثلاً اس کا سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں لفظ برکنا کا اختلاف دکھانا۔ حالانکہ یہ اختلاف کوئی نہیں۔ ڈاکٹر منگانا کہتا ہے۔ قرآن کریم میں بارکنا ہے۔ اور اس کے دریافت کردہ اوراق میں برکنا اور پھر برکنا کے معنے وہ گھٹنے ٹیکنا کرتا ہے۔ یہ محض حماقت ہے قرآن کریم کی طرز تحریر میں بارکنا نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ اسی لفظ کو اب تک برکنا لکھا جاتا ہے پرانی طرز تحریر میں اوپر کا الف نہیں لکھا جاتا تھا۔ مگر پڑھنے میں آتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم صرف تحریر میں محفوظ نہ تھا بلکہ ابتدا سے ہی تحریر کے ساتھ حافظوں میں بھی محفوظ تھا۔ اگر اسی قسم کے اختلاف نکالنے تھے تو ڈاکٹر منگانا کو اور بھی بہت سے اختلافات مل سکتے تھے۔ مثلاً النو بیلہ۔ میں گو ہمارے قرآنوں میں طرز تحریر خلاقھم اور خلا قکم ہے۔ مگر ان اوراق میں خلقھم لکھا ہے۔ اس کو کیوں ڈاکٹر منگانا بجائے خلاق کے خلق پڑھ کر پیدائش معنی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ معنے تو کچھ بن بھی جاتے ہیں۔ مگر المسجد الحرام الذی برکنا حولہ کے معنے کچھ بھی نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اس کو برکنا نہ پڑھیں برکنا پڑھیں۔ تو گویا خدا کہتا ہے کہ مسجد حرام جس کے گرد ہم نے گھٹنے ٹیکے تھے۔ جو بالکل بمعنی فقرہ ہے۔ حالانکہ برکنا کے معنے صاف ہیں۔ کہ ہم نے برکت دی تھی۔ اسی قسم کا ایک اور فرق ہے یعنی سورہ نحل آیت ۲۲ میں ڈاکٹر منگانا کہتا ہے کہ آیات کی بجائے ایت لکھا ہے حالانکہ وہ درحقیقت ایٰت ہے تعجب ہے کہ وہی ڈاکٹر منگانا جو اسبات کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ اس لکھنے والے کی طرز تحریر بھی ایسی ہے کہ وہ قرآن کو قرن لکھتا ہے۔ وہ اس قدر موٹی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ کہ آیات دوسری طرح پر بھی لکھا جا سکتا ہے یعنی ایٰت اس کی بیسیوں مثالیں اسی تحریر میں موجود ہیں۔ مثلاً تصریف الریاح کو تصریف الریح

لکھا ہے۔ حالانکہ مُراد الیہ ہی ہے۔ اور کلمات کو کلمتہ لکھا ہے۔ حالانکہ مُراد کلمتہ ہے۔ اور الاعراف ۱۴۴ میں بکلامی کو بکلمی لکھا ہے۔ اور وہیں ۱۴۲ و ۱۴۹ میں الالواح کو الالوح لکھا ہے۔ اور لمیقاتنا کو لمقتنا لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر منگانا نے یہ معنے کیوں نہ کر لیئے۔ کہ موسےٰ ہماری بزرگی کے لئے آئے؟ صرف اسلئے کہ یہ معنے بن نہ سکتے تھے؟ پھر جب اس لکھنے والے کی طرز تحریر ہی یہ ہے۔ اور ڈاکٹر منگانا خود اِس بات کو اس کی خصوصیات میں سے بتاتا ہے۔ تو اسی طرز تحریر کی بیسیوں مثالوں میں سے ایک دو کو اختلاف کے رنگ میں پیش کر دینا محض شرارت نہیں تو اَور کیا ہے +

بہت سی مثالیں اسی قسم کی دیگئی ہیں۔ کہ و کی جگہ ف یا ف کی جگہ و ہے۔ یا و یا ء کو بڑھا دیا یا چھوڑ دیا گیا ہے یا یُوں ہی کوئی اور چھوٹا سا فرق ہے۔ مثلاً یہ کہ سُورۃ الرعد ۲۶ میں اللہ کی جگہ واللہ ہے۔ لکھنے والے کو معمولی غلطی لگ گئی ہے۔ النحل ۱۷ میں افلا کی جگہ اولا ہے۔ پتھر سے رگڑنے میں نقطہ اُڑ گیا ہے اور فا۔ ل سے الگ ہو گیا ہے۔ یا یہ بھی محض معمولی غلطی ہے جو لُورا یاد نہ ہونے سے لگ سکتی ہے۔ ابراہیم ۳ میں ضلال کی جگہ ضل ہے۔ مَیں کہتا ہوں جو شخص اذا تنا کو اذنا لکھ سکتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر منگانا نے خود مثال دی ہے اور جنودا کو جندا لکھ سکتا ہے۔ اور واتبعوہ کو واتبعہ لکھ سکتا ہے کیا ضلال کی جگہ ضل لکھ دینا اس سے کچھ بعید ہے ایسا ہی الحجر ۹۴ میں واعرض کی جگہ واعرض ہے جہاں ممکن ہے کہ نقطہ کسی اُوپر کی تحریر سے زائد پڑ گیا ہے۔ پھر الرعد ۳۳ میں زین کی جگہ فزین ہے جو صریح غلطی ہے کیونکہ فزین پڑھ کر وہاں عبارت ہی نہیں بن سکتی۔ اصل عبارت ہے بل زین للذین کفروا۔ اسکی بجائے اگر یُوں پڑھیں کہ بل فزین للذین کفروا تو یہ عربی ترکیب نہیں۔ بل اور ف دونوں میں سے ایک ہی رہ سکتا ہے۔ پھر ایک اختلاف یہ دکھایا گیا ہے کہ ھود ۲۴ میں الاخسرون کو لخسرون لکھا ہے۔ حالانکہ بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ الاخسرون کو لکھنے والے نے حسب معمول اخسرون کا الف چھوڑ کر لخسرون لکھا ہے۔ اسمیں سے پہلا الف چونکہ پچھلی سطر کے آخر پر آیا ہے وہ اُدھر رہ گیا ہے۔ اور لخسرون سطر کی ابتداء میں آگیا ہے پھر وہ سطر کے آخر کا الف اُڑ گیا ہے۔ اسکی مثال اس سے دو سطر اُوپر ہی موجُود ہے۔ جہاں الظلمین کا الف پہلی سطر کے آخر پر ہے۔ اور اگلی سطر کی ابتدا میں صرف لظلمین ہے۔ یہی حال اس سے اگلے اختلاف احبتوا اور خبتوا کا ہے جہاں پہلا الف ہمزہ کی بجائے سمجھ کر لکھنے میں ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ساری طرز تحریر میں ہمزہ کہیں بھی نہیں لکھا گیا۔ یا پتھر کی رگڑ سے محو ہو گیا ہے پھر ایک اختلاف النحل ۳۸ میں فانظروا کی جگہ وانظروا لکھا ہے۔ جو اگر غلطی نہیں تو محض ف کا نقطہ بالکل محو ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد کی دو مثالیں جیسی التوبہ ۳۶ میں فیھن کی جگہ فیھا ہونا اور فاصابھم کی جگہ فاصابتھم ہونا محض کاتب کی غلطیاں ہیں +

بارھواں اختلاف اور انیسواں پھر ڈاکٹر منگانا کی تعصب کے یرقان سے بیمار آنکھ کا نتیجہ ہے سُورۃ توبہ آیت ۲۴ اِن الفاظ پر ختم ہوتی ہے واللہ لا یھدی القوم الفاسقین اور آیت ۳۷ واللہ لا یھدی القوم الکفرین۔ اب پڑھنے میں پہلی کی یا دونوں جگہ نہیں پڑھی جاتی۔ کیونکہ وہ

القوم کے ل کے ساتھ ملجاتی ہے۔ یا تو اس خیال سے لکھنے والے نے اسے نہیں لکھا۔ اور یا یا ویسے ہی رہ گئی ہے۔ بہر حال بجائے بعد القوم کے بعد القوم ہے۔ مگر ڈاکٹر منگانا نے ناواقف پبلک کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے اسے ایک اختلاف عظیم ٹھیرایا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ اسے لا بعدا ایک لفظ القوم دوسرا لفظ بناتا ہے۔ جہاں ل حرف جر قرار دیا ہے۔ ھلا بعد ع کے معنے ہیں حالت سکون میں ہونا۔ اور اس لیے معنے یوں کرتا ہے۔ کہ خدا فاسق لوگوں کی طرف (اور دوسری جگہ کافر لوگوں کی طرف) حالت سکون میں نہیں ہوگا۔ الگ اس سے کہ عبارت بے معنی ہو جاتی ہے جس سے شاید ڈاکٹر منگانا کو کچھ غرض نہیں۔ کیونکہ کوئی لفظ با معنی بن جائے سہی خواہ وہ سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے کچھ معنے نہ دے۔ ڈاکٹر منگانا کے لیے یہی کافی ہے۔ ڈاکٹر منگانا پر قول کسے حافظ نباشد کی مثال صادق آتی ہے کیونکہ بعدا میں تو ہمزہ آخر میں آتا ہے۔ اور ہمزہ کے متعلق وہ تسلیم کر چکا ہے کہ اس طرز تحریر میں ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ پھر اب ایک اختلاف بنانے کیلئے ہمزہ بھی لکھ لیا گیا۔ لیکن چلو یوں بھی مان لیں تو غالباً ڈاکٹر منگانا کے اہل زبان ہونے نے اسے اتنی مدد بھی نہ دی۔ کہ اسے یہ خیال رہتا کہ دونوں صورتوں میں قوم کی صفت الکفرین اور الفاسقین پڑی ہوئی ہے۔ اور اگر صفت پر ال ہے تو موصوف ال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس القوم میں ا بعد کا حصہ نہیں بن سکتا اور نہ ل حرف جر بن سکتا ہے۔ بلکہ ال تعریفی جس طرح الفاسقین اور الکافرین کے ساتھ ہے۔ اسی طرح موصوف القوم میں بھی ہونا ضروری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر منگانا نے کس قدر اپنے مسلمات کے خلاف۔ قواعد کے خلاف اختلاف بنانے کی کوشش کی ہے جس شخص کے دل کی حالت ایسی ہو۔ وہ الفاظ اور حروف کو ایک ایسے مختلط مسودہ میں درست کس طرح پڑھ سکتا ہے۔ اور اس کی شہادت کس طرح قابل اعتبار رہ سکتی ہے +

اس سے آگے جو اختلاف دکھایا ہے وہ بھی محض ایک مغالطہ ہے۔ بنی اسرائیل ۹۴ میں ڈاکٹر منگانا کہتا ہے۔ ءانا کی بجائے اتا لکھا ہے مغالطہ کے لیئے ڈاکٹر منگانا ءاتا کو اانا لکھتا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ خود کہہ چکا ہے کہ ہمزہ اس طرز تحریر میں بالکل نہیں لکھا گیا۔ اسلیئے اگر وہ قرآن شریف کے لفظ کو درست طور پر ءاتا لکھتا تو اسکی یہ تحریر ہی اُسکے اعتراض کا جواب ہو جاتی۔ پس اس نے محض دھوکا دینے کے لیئے ءانا کی بجائے اانا لکھ دیا ہے۔ اور پھر اعتراض کر دیا ہے۔ الا تعتدوا کی جگہ فلا تعتدوا (بنی اسرائیل ۲۴) ومن کی جگہ فمن (التوبہ ۲۳) معمولی اختلاف سہو کاتب ہے۔ یا ڈاکٹر منگانا کے پڑھنے میں غلطی ہے مثلاً اول الذکر مثال کو لیلو۔ اصل الفاظ یوں ہیں۔ وقضی ربك الا تعبدوا الا ایاہ۔ اب اگر الا کی جگہ فلا پڑھیں تو عبارت درست نہیں رہتی۔ ھود ۳۱ میں اَ ل کم کی جگہ ارکیم کو اختلاف بتانا بھی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ارىكم لکھا جاتا ہے۔ کاتب نے حسب معمول اوپر کا الف نہیں لکھا۔ ڈاکٹر منگانا نے اسے اختلاف ٹھیرا کر الٹ پلٹ معنے کر دیئے۔ ھود ۳۴ جادلتنا کی جگہ جادلت ممکن ہے محض آخری نا کے غور و خوض سے رہ گیا ہو۔ یا کاتب کی غلطی ہو۔ المومن ۸۵ میں فلم یك ینفعھم کی جگہ فلم یکن ینفعھم

بھی اِسی قبیل سے ہے۔ السجدۃ ۱۱ میں فقال کی جگہ فقیل اختلاف نہیں محض دوسری طرز تحریر ہے۔ اگر یحادد کی جگہ یحید اختلاف نہیں (التوبہ ۴ - ۶) تو قال کی جگہ قیل بھی اختلاف نہیں خصوصاً اسلئے کہ قرآن کریم میں بعض جگہ قال کی بجائے قل بھی لکھا ہے ممکن ہے لکھنے والے کو اسی سے غلطی لگی ہو۔ السجدۃ ۵ میں اننا کی جگہ انما صرف ننا کے دوسرے نقطہ کے نون کے دندانہ کے ساتھ ملجانے سے نما کی شکل ہوگئی ہے۔ ورنہ اصل عبارت میں فاعمل اننا عملون تو ایک معنے رکھتا ہے۔ تو عمل کر ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔ مگر فاعمل انما عملون کے کوئی معنے نہیں بنتے۔ وقال کی جگہ قال (العنکبوت ۲۴) لجعلکم کی جگہ جعلکم (النحل ۹۵) وما کی جگہ ما (التوبہ ۵۴) واذا کی جگہ واذ (النحل ۸۷) یہ سب اول حرف اور آخری سطر میں آخری حرف کے بالکل محو ہوجانے کا یا محض سہو کاتب کا نتیجہ ہے۔ اثیم کی جگہ اثم (الدخان ۴۴) طرز تحریر کا اختلاف ہے۔ کیونکہ اثیم کو اثم بھی لکھا جاسکتا ہے جیسے ابراھیم کو ابرھم لکھا جاسکتا ہے۔ النحل ۱۱۲ میں عملت کی جگہ عملتہ یا اُوپر کی تحریر کے خلط سے بنگیا ہے یا صریح غلطی ہے۔ اور النحل ۳۰ میں بلی کی جگہ بل بالکل بےمعنے ہے۔ اسلئے یا تو کاتب کی نرالی طرز تحریر کا نتیجہ ہے اور یا بلی میں لام اور یٰ کا درمیانی دندانہ محو ہوگیا ہے۔ ایک انکار پر بلی ان اللہ علیم بما کنتم تعملون تو جواب ہوسکتا ہے لیکن بل ان اللہ علیم ترکیب کے لحاظ سے بھی درست نہیں۔ کیونکہ بل کے بعد ان نہیں چاہیئے۔

قسم اول کے اختلاف

قسم اوّل کے اختلافات چار ہیں جنمیں سے دو اختلاف ایک آیت میں تجویز کئے گئے ہیں۔ اور بڑی چالاکی سے ایک اختلاف بنانے کیلئے دوسرا اختلاف خود تجویز کرلیا گیا ہے۔ الجاثیۃ میں انیسویں آیت یُوں ہے انھم لن یغنوا عنك من اللہ شیئا اسکی بجائے ڈاکٹر منگانا تجویز کرتے ہیں انھم لن یغنوا عنك من اللکم ھکما اِس تحریر میں ڈاکٹر منگانا کا دعویٰ ہے کہ شیئا کی بجائے واقعی ھکما لکھا ہوا ہے مگر کیا اللہ کی بجائے اللکم لکھا ہوا ہے؟ ڈاکٹر منگانا کے مُسوّدہ کو پڑھنے سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے کیونکہ اصل مسودہ میں یہ صاف اعتراف ہے کہ لن یغنوا عنك من کے بعد کا لفظ پُورا پڑھا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کا صرف ایک حصہ اللہ پڑھا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ہم ڈاکٹر منگانا نے اپنے دماغ موصر سے تجویز کرلیا ہے۔ حالانکہ جس قدر حصہ لفظ کا پڑھا جاتا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ لفظ اللہ ہے صرف آخری ہ کا دندانہ اُڑا ہوا ہے۔ یہ صریح بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے۔ جب اصل عبارت میں اللہ کا لفظ موجود ہے۔ اور ایک مخلوط اور دُھلے ہوئے مسودہ میں اللہ کا پہلا حصہ اللہ صاف پڑھا جاتا ہے۔ تو ایک منصف مزاج پڑھنے والا مجبور ہوگا کہ اسے اللہ ہی مانے۔ مگر چونکہ ایکے ربط لفظ ھکما کے کچھ معنے بنانے تھے۔ اسلئے صریح تحریف کرکے یہ کہدیا کہ اللہ کی بجائے اللکم ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس تحریف سے بھی ڈاکٹر منگانا کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انھم لن یغنوا عنك من اللکم ھکما جس کے معنے ڈاکٹر منگانا نے یہ کئے ہیں۔ کہ تمسخر کرتے ہوئے وہ تیرے لئے ایک ملکے

کی جگہ نہیں لیں گے خود ایک بے معنی فقرہ ہے۔ ممکن ہے یہاں ہی تعلیم کی دائیں گال کا تھپڑ ڈاکٹر صاحب کو یاد آ گیا ہو ورنہ عبارت اس صورت میں بےمعنی ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ شیئا کا لفظ کچھ نقطوں اور دندانوں کی سیاہی پھیلجانے سے اور کچھ اوپر کی تحریر سے گڈمڈ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر منگانا نے خدا جانے کتنی لغت کی کتابیں تلاش کر کے اس کو ایک بامعنی لفظ بنایا یعنی ھکم جس کے معنے تمسخر کے ہیں۔ مگر چونکہ انہم لن یغنوا عنك من اللہ ھکما کے کچھ معنے نہ بنتے تھے۔ اسلئے کچھ تحریف سے مدد لی۔ اور اللہ کی بجائے الذکم لکھ دیا۔ یہ ہے ان لوگوں کی تحقیق کی حالت۔ حالانکہ اسی قسم کا محاورہ جہاں شئ کا لفظ آخر میں آتا ہے قرآن کریم میں کئی جگہ موجود ہے +

تیسرا اختلاف قسم اول میں التوبہ کی آیت ۴۳ میں دکھایا گیا ہے یعنی یہ کہ وتعلم کی جگہ ومنھم ہے۔ وہاں بھی تحریف ہی ڈاکٹر صاحب کی معاون ہوئی۔ الفاظ قرآنی یوں ہیں وتعلم الکاذبین۔ ڈاکٹر منگانا اپنے مسودہ میں بتاتا ہے کہ الکاذب تک تو پڑھا جاتا ہے۔ مگر آخری ین محو ہو چکے ہیں۔ اب تعلم کو منھم بنانے میں ایک دقت پیش آتی تھی۔ یعنی اگر الکاذبین ہی پڑھا جائے تو ومنھم الکاذبین درست عبارت نہیں بنتی۔ اسلئے ڈاکٹر منگانا نے جھٹ بجائے الکاذبین کے الکاذبون بنا دیا۔ پس ان کا کذب تو خود الکاذبون کے بنانے سے ظاہر ہو گیا +

صرف ایک مثال ایسی دیکھی ہے جہاں واقعی لفظ کی تبدیلی بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ الاعراف ۱۵۴ میں بجائے وفی نسختھا ھدی ورحمۃ کے وفی نسختھا ھدی وسلم ہے سو اگر ڈاکٹر منگانا نے اس لفظ کو تعصب کی پٹی کھول کر پڑھا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کاتب کی صریح غلطی ہے۔ کوئی قرات ھدی وسلم کی ہمیں نہیں ملتی۔ اور قرآن کریم میں ھدی ونور یا ھدی ورحمۃ تو آیا ہے مگر ھدی وسلم کسی جگہ نہیں آیا +

اب تیسری قسم کے اختلافات کو لیتے ہیں۔ سب سے پہلے کہا جاتا ہے کہ النحل ۹۳ میں قرآن کریم میں ہے یضل من یشاء مگر ڈاکٹر منگانا کے نسخہ میں ہے یضل اللہ من یشاء۔ اگر ہمارے پاس اور کوئی قرینہ نہ ہوتا تو بھی ہم کہتے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ جب تک اسکی تائید کرنے والا کوئی اور نہ ہو۔ مگر یہاں تو قرینہ بھی صاف ہے۔ کیونکہ یہاں عبارت یوں ہے ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء پس اگر یضل کے بعد اللہ کا لفظ پڑھائیں تو دونوں فقروں کی موزونیت باقی نہیں رہتی۔ بہرحال کسی کاتب کے ایک لفظ زائد لکھ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوا کرتا کہ اصل غلط ہے اور نقل درست۔ اور نہ آج تک کسی عدالت میں اس طرح پر اصل کو غلط تسلیم کیا گیا ہے۔ غلطی نقل کی سمجھی جائیگی۔ اور اصل کی غلطی کے لیئے کوئی اور واقعات تائیدی ہونے چاہئیں۔ جن سے غلطی کا ثبوت ملے +

اختلافات قسم سوئم

ایسا ہی التوبہ ۳۸ میں یا ایھا الذین امنوا مالکم اذا قیل لکم میں ڈاکٹر منگانا کے

نسخہ کے کاتب نے الفاظ مالکم سہواً چھوڑ دیئے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر منگانا اچھل پڑے کہ دیکھو ثابت ہو گیا کہ اصل قرآن میں الفاظ مالکم زائد ہیں۔ یہ ان لوگوں کی منطق اور یہ انکا استدلال ہے۔ اسبات کا قطعی ثبوت خود اسی نسخہ سے ہمیں ملجاتا ہے۔ کیونکہ اسی سُورت کی آیت ۳۳ میں ھو الذی ارسل رسولہ میں لفظ ھو کاتب نے چھوڑ دیا۔ اور پھر جیسا کہ ڈاکٹر منگانا کو اعتراف ہے۔ یہ لفظ حاشیہ پر بڑھایا گیا۔ حالانکہ اصل بات صرف اس قدر ہے کہ الذی ارسل رسولہ سے چونکہ سطر شروع ہوتی ہے۔ اسلیئے جو لفظ ھو ابتدا سے رہگیا تھا وہ مجبوراً حاشیہ پر ہی جانا تھا اور ہے درحقیقت وہ ابتدائے سطر میں جہاں ہی ہونا چاہیئے۔ اب یہ بات کہ یہ مختلف ہاتھ کا ہے۔ اگر محض اسی تعصب کا نتیجہ نہیں جس کی ہم کئی مثالیں دیکھ چکے ہیں۔ تو بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ غلطی دیکھ کر کسی نے درست کر دیا۔ خود کاتب نے درست نہ کیا کسی دوسرے نے کر دیا بہرحال معلوم ہوا کہ غلطی کو تسلیم کر لیا۔ پس اسی طرح اگر مالکم کے لفظ رہگئے تو کیا اندھیر آگیا۔ سہو کاتب کو اختلاف بتانا خود اسبات پر شاہد ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت پر حملہ کرنے کیلیئے کن کن ہتھیاروں سے ان لوگوں کو کام لینا پڑتا ہے +

ایک تیسرا لفظ اسی طرح رہا ہوا اسی سورت کی آیت ۳۶ میں ہے۔ جہاں بجائے وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ کے یوں لکھ دیا ہے۔ وقاتلوا المشرکین کما یقاتلونکم کافۃ۔ یہاں بھی کما کا لفظ چاہتا ہے کہ جس طرح پر آخر میں کافۃ آیا ہے۔ کما سے پہلے بھی کافۃ ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں آیتیں جن میں یہ تین لفظ رہ گئے ہیں ایک ہی جگہ واقع ہیں یعنی سُورہ توبہ کی آیت ۳۳ سے لیکر ۳۸ میں ہی ہیں۔ اور ان تینوں میں سے ایک غلطی کا درست کر دینا بھی ڈاکٹر منگانا کے اعتراض کا کافی جواب ہے + اب اس پہلو کو ترک کر کے ہم دوسرے پہلو کو لیتے ہیں۔ کہ ان مسودات سے قرآن کریم کی حفاظت پر کسقدر مثبت نتائج پیدا ہوتے ہیں سوائے ان اختلافات کے جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اسی نسخہ میں قرآن شریف سے کوئی اہم اختلاف نہیں پایا جاتا۔ تمام سورتوں میں آیتوں کی ترتیب وہی ہے جو مستند نسخہ قرآن کریم میں ہے۔ کہیں کسی آیت کی کمی بیشی نہیں کسی لفظ کی کمی بیشی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب کی درستی پر بھی اس سے شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ سورتیں اسی ترتیب سے لکھی ہوئی ہیں مثلاً ڈاکٹر منگانا کے مسودہ میں صفحہ ۶۹ پر سورہ المؤمن ختم ہو کر اسی صفحہ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ سُورۃ فصلت یا حٰم السجدہ کا شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترتیب قرآن کریم میں ہے۔ ایسا ہی صفحہ ۲۷ پر سُورہ الدخان ختم ہو کر فوراً الجاثیہ شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترتیب ہمارے قرآن کریم میں ہے پس یہ ایک مزید شہادت اسبات پر ہے۔ کہ سارے قرآن کریم میں سورتوں کی ترتیب میں۔ اور ہر ایک سُورت میں آیتوں کی ترتیب میں۔ یا کسی کمی بیشی کے لحاظ سے قطعاً کوئی اختلاف کبھی نہیں ہوا +

۷۔ سبعۃ احرف اور اختلافِ قرأت

اختلاف قرأت سے حفاظت قرآن پر دو اعتراض

اختلاف قرأت کے متعلق یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس سے دو طرح پر قرآن شریف کی حفاظت میں نقص کا ثبوت ملتا ہے۔ اوّل اس طرح پر کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض قرأتوں کی اجازت دی تھی۔ مگر چونکہ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اسلیئے ان کے ضائع ہونے سے گویا قرآن شریف کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ کیونکہ یہ قرأتیں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بذریعۂ وحی بتائی تھیں۔ اور دوسرے اِس طرح پر کہ اب جو مختلف قرأتیں موجود ہیں ان کو سامنے رکھ کر ایک شخص کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ کونسی قرأتیں اصلی اور حقیقی طور کلام الٰہی ہیں۔ اور کہ موجودہ قرآن کریم میں کونسی ایک قرأت کو اختیار کرلیا ہے۔ یہ اعتراض ایک حد تک اِس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ کہ سبعۃ احرف مذکورہ احادیث سے مراد قرأت متفرقہ لیجاتی ہیں اور حرف اور قرأت کے معنوں میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ اسلئے سب سے پہلے سبعۃ احرف کی تشریح صفائی بیان کے لئے ضروری ہے +

سبعۃ احرف سے مراد

جاننا چاہئیے کہ جو اجازت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بذریعۂ وحی دی تھی وہ قرآن شریف کو سبعۃ احرف یعنی سات حروف پر پڑھنے کی اجازت تھی اور احادیث صحیحہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے لفظ احرف یا حرف کا ہی فرمایا ہے۔ سب سے پہلے اِس لفظ کے لغوی معنوں پر غور کرنا ضروری ہے حرف کے معنے عربی لغاتوں میں دیئے گئے ہیں۔ زبان یا محاورہ یا طرز ادا جو بعض عرب اقوام کے ساتھ مخصوص ہو تاج العروس میں مشہور حدیث کے اِس ٹکڑے کو کہ نزل القرآن علی سبعۃ احرف بیان کرکے اس کے معنوں کی تشریح یوں کی گئی ہے۔ کہ ای علی سبع لغات من لغات العرب یعنی قرآن شریف نازل ہؤا سات لغتوں پر عرب کی لغتوں سے۔ یا اس کے معنے ہیں جیسا کہ بعض دوسری لغت کی معتبر کتابوں میں دیئے گئے ہیں سات طرزوں پر جو الفاظ کے ادا کرنے سے پیدا ہوتی ہیں جیسا کہ یہ کہا جائے کہ فلان یقرأ بحرف ابن مسعود تو مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص ابن مسعود کی طرز ادا پر پڑھتا ہے لفظ حرف کے ان معنوں سے یہ ظاہر ہے کہ جن اختلافات حروف کا ذکر بعض حدیثوں میں ہے وہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ عرب کی مختلف قومیں بعض وقت ایک ہی لفظ کو مختلف طور پر ادا کرتی تھیں۔ اور اس کی مثالیں ہر زبان میں موجود ہیں کہ ایک قوم ایک لفظ کو ایک طرح پر ادا کرتی ہے۔ اور اسی ملک کی دوسری قوم اس لفظ کو دوسری طرح پر ادا کرتی ہے +

اختلاف حروف والی احادیث

اب ہم اِن تمام احادیث کو جن میں اختلاف حروف کا ذکر آیا ہے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ آیا واقعی طور پر احادیث کا بھی یہی منشا ہے۔ اس کے متعلق مندرجہ ذیل احادیث معتبر کتب احادیث سے لی گئی ہیں +

(۱) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرأنی جبریل علی حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ ویزیدنی حتی انتھی الی سبعۃ احرف (بخاری) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل نے مجھے قرآن شریف ایک حرف کے مطابق پڑھایا۔ میں نے

اس سے مراجعت کی یعنی بار بار اس بات کو دوہرایا کہ زیادہ حروف میں پڑھے پس وہ تعداد کو بڑھاتا گیا یہانتک کہ سات پر پہنچ گیا یہی حدیث انہی الفاظ کے ساتھ مسلم نے بیان کی ہے مگر اس میں اتنے الفاظ ابن شہاب کی روایت سے اور زیادہ ہیں۔ قال ابن شہاب بلغنی تلک السبعۃ الاحرف انما ھی فی الامر یکون واحدا لا یختلف فی حلال ولا حرام یعنی ابن شہاب نے کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ سات حروف ایسے امر میں ہیں جو ایک ہی ہے (یعنی مختلف حروف میں پڑھنے سے معنوں میں کوئی تغیر نہیں آتا) اور اس سے حلال اور حرام میں کوئی فرق نہیں آتا +

(۲) عن عمر بن الخطاب یقول سمعت ھشام بن حکیم یقرأ سورۃ الفرقان فی حیاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاستمعت لقرأتہ فاذا ھو یقرأ علی حروف کثیرۃ لم یقرئنیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکدت اساورہ فی الصلوۃ فتصبرت حتی سلم فلببتہ بردائہ فقلت من اقرأک ھذہ السورۃ التی سمعتک تقرأ قال اقرأنیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت کذبت فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد اقرأنیھا علی غیر ما قرأت فانطلقت بہ اقودہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت انی سمعت ھذا یقرأ بسورۃ الفرقان علی حروف لم تقرئنیھا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارسلہ اقرأ یا ھشام فقرأ علیہ القرأۃ التی سمعتہ یقرأ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذالک انزلت قال اقرأ یا عمر فقرأت القرأۃ التی اقرأنی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذالک انزلت ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف فاقرؤا ما تیسر منہ (بخاری) قریبا انہی الفاظ میں یہ روایت صحیح مسلم میں بھی آئی ہے۔ ماحصل اس حدیث شریف کا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورۃ فرقان پڑھتے سنا۔ جب میں اس کے پڑھنے کو غور سے سننے لگا تو میں نے معلوم کیا کہ وہ بہت سے ایسے حروف پر پڑھتا ہے جن پر رسول اللہ صلعم نے مجھ کو نہیں پڑھایا۔ قریب تھا کہ میں نماز میں ہی اس پر حملہ کرتا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا یہاں تک کہ ہشام رضؓ نے سلام پھیرا۔ پھر میں نے ان کی چادر ان کے گلے میں ڈال لی اور کہا کہ یہ سورۃ جو میں نے تمہیں پڑھتے سنا ہے کس نے تم کو پڑھائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو پڑھائی۔ میں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان حروف کے غیر پر پڑھایا جن پر تم پڑھتے ہو پھر میں ان کو اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لیکر چلا گیا اور عرض کی کہ میں نے ان کو یعنی ہشام کو ایسے حروف پر سورۃ فرقان پڑھتے سنا ہے۔ جن پر آپ نے مجھ کو نہیں پڑھایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہیں چھوڑدو اور فرمایا ہشام تم پڑھو۔ انہوں نے وہی قرأت پڑھی جو میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح یہ نازل ہوئی۔ پھر فرمایا۔ اے عمر تم پڑھو۔ میں نے اسی طرح پڑھا جس طرح آپ نے مجھ کو پڑھایا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح یہ

نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے پس جو تم پر آسان ہو پڑھو +

(۳) عن ابن مسعود قال سمعت رجلا یقرأ وسمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ خلافها فجئت به النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرته فعرفت فی وجهه الکراهیة فقال کلا کما محسن فلا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا فهلکوا (بخاری) ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن شریف پڑھتے سنا اور میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور طرح پر پڑھتے سنا تھا پس میں اسکو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا۔ اور آپ کو اسبات کی خبر دی میں نے دیکھا کہ آپکے چہرہ پر ناراضگی کے آثار ہیں۔ آپ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔ پس اختلاف مت کرو۔ کیونکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں انہوں نے اختلاف کیا۔ تو ہلاک ہو گئے +

(۴) عن ابی بن کعب قال کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرأ قرأة انکرتها علیه ثم دخل اٰخر فقرأ قرأة سوی قرأة صاحبه فلما قضینا الصلوٰة دخلنا جمیعاً علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت ان هذا قرأ قراءة انکرتها علیه ودخل اٰخر فقرأ سوی قراءة صاحبه فامرهما النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقراء ا فحسن شانهما فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذ کنت فی الجاهلیة فلما رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قد غشینی ضرب فی صدری ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ فرقاً فقال لی یا ابی ارسل الی ان اقرأ القراٰن علی حرف فرددت الیه ان هوّن علی امتی فرد الی الثانیة اقراه علی حرفین فرددت الیه ان هون علی امتی فرد الی الثالثة اقرأه علی سبعة احرف (مسلم) ابی بن کعب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا تو ایک آدمی آیا اور نماز پڑھنے لگا اور اس نے قرأت پڑھی جس پر میں نے اعتراض کیا پھر ایک اور آدمی آیا اور اُس نے پہلے سے بھی اختلاف کے ساتھ قرأت پڑھی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہو چکے تو ہم سب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایک قرأت پڑھی جس کے متعلق میں نے اس پر اعتراض کیا۔ پھر دوسرا شخص آیا تو اس نے اس سے بھی مختلف قرأت پڑھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو حکم دیا اور انہوں نے پڑھ کر سُنایا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی قرأت کو پسند فرمایا۔ اس پر میرے دل میں ایک ایسا تکذیب کا خیال یکا یک گذرا کہ جاہلیت میں بھی ایسا خیال نہ گذرا تھا۔ جب رسُول اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کیسا وسوسہ میرے دل میں گذرا ہے تو آپنے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور میرا پسینہ چلنے لگا۔ گویا مارے خوف کے میں اللہ تعالےٰ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آپنے فرمایا اے ابی مجھے بھی حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی حرف پر قرآن کو پڑھوں پھر میں نے اسبات کو لوٹایا۔ اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی کیجائے۔ پھر دوبارہ مجھے یہ فرمایا گیا کہ دو حرفوں پر پڑھو۔ میں نے پھر اسبات کو لوٹایا اور عرض کیا۔ کہ میری اُمت پر آسانی کیجائے۔ پھر تیسری مرتبہ مجھے اجازت دیگئی کہ سات حرفوں پر پڑھ لو +

(۵) عن ابی بن کعب قال لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل فقال یا جبرئیل انی بعثت الی امۃ امیین منھم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریۃ والرجل الذی لم یقرأ کتابا قط قال یا محمد ان القران انزل علی سبعۃ احرف (ترمذی) ابی بن کعب سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے ملے اور فرمایا اے جبرئیل میں امّی لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں جن میں بوڑھی عورتیں اور بوڑھے مرد اور لڑکے اور لونڈیاں اور ایسے آدمی ہیں جنہوں نے کبھی کتاب نہیں پڑھی۔ جبرئیل نے کہا اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) قرآن سات حرفوں پر اُتار آگیا ہے +

(۶) عن ابی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان عند اضاۃ بنی غفار فاتاہ جبریل فقال ان اللہ یامرک ان تقرئ امتک القران علی حرف الحدیث (مسلم) مسلم کی اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سات حروف پر پڑھنے کی اجازت ملی تو آپ اضاۃ بنی غفار کے پاس تھے۔ باقی حدیث کا وہی مطلب ہے جو پہلے بیان ہؤا +

(۷) عن جابر قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نقرأ القران وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرؤا فکل حسن وسیجیٔ اقوام یقیمونہ کما یقام القدح یتعجلونہ ولا یتاجلونہ (ابو داؤد) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم پر آنکلے اور ہم قرآن پڑھ رہے تھے اور ہمارے درمیان اعرابی اور عجمی لوگ تھے آپنے فرمایا پڑھتے جاؤ سبھی ٹھیک پڑھ رہے ہیں اس کے بعد ایسی قومیں آئیں گی جو قرآن کو بڑی صفائی سے پڑھینگی ایسی صفائی سے جیسا کہ تیر سیدھا کیا جاتا ہے مگر وہ اس کا اجر اسی زندگی میں تلاش کرینگی اور عاقبت کی پرواہ نہیں کرینگی +

سات حروف پر قرآن پڑھنے کی اجازت کب ہوئی

یہ چند احادیث ہیں جو قرأت مختلفہ کے متعلق آئی ہیں۔ ایک بات جس پر ان ساتوں حدیثوں سے متفقہ شہادت ملتی ہے یہ ہے کہ جو کچھ اختلاف تھے وہ قرآن کریم کی عبارت کے اختلاف نہ تھے بلکہ بعض الفاظ کو مختلف طور پر پڑھنے یا ادا کرنے کے اختلاف تھے! اس بات کو صاف کرنے کیلئے ان چند امور کو جو ان احادیث سے پیدا ہوتے ہیں ایک ایک کر کے زیر بحث لانا ضروری ہے۔ سب سے پہلے جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور جس سے قطعی شہادت ان اختلافات کی حقیقت کے متعلق ملتی ہے وہ وقت کا سوال ہے یعنی اس امر کی تحقیق کرنا کہ سات حروف میں قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت کس وقت دیگئی۔ پس ان احادیث کو آگے رکھ کر ہمنے یہ دیکھنا ہے کہ آیا سات حروف میں قرآن شریف کا نزول ابتدا سے ہی تھا۔ یا کسی خاص وقت کسی خاص ضرورت کے لحاظ سے اجازت حروف مختلفہ میں ادا کرنے کی بعد میں دیگئی۔ کیونکہ اگر جب سے نزول قرآن شریف کا شروع ہؤا۔ اسی وقت سے سات حروف میں اس کا نزول تھا۔ تو اس میں ایک معترض کو اس اعتراض کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ وہی سات حروف ہمیشہ کے لیئے چلے آنے چاہئیں تھے اور اگر وہ ساتوں حروف ہم تک نہیں پہنچے تو اس سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ کچھ قرآن شریف کا حصّہ ضائع ہوگیا لیکن اگر سات حروف کا نزول بعد میں ہؤا اور ابتداءً قرآن شریف کا نزول ایک ہی حرف میں تھا تو ایسا اعتراض کسی صورت

میں ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سات حروف میں نزول کسی خاص ضرورت کی وجہ سے ہوا اور ان سات حروف کو اصل قرآن شریف سے جیسا کہ وہ ابتدا سے نازل ہو رہا تھا کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ بعض ضرورتوں کی وجہ سے ایک وقت کے لئے بعض لوگوں کو ایسی اجازت دیگئی +

استدلال اوّل زمانہ اجازت حروف کے متعلق چھٹی حدیث سے پیدا ہوتا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضاۃ بنی غفار کے قریب تھے جب آپ کو سات حروف پر قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دیگئی۔ اضاۃ بنی غفار ایک مشہور مقام مدینہ میں ہے۔ پس زمانہ کے متعلق اس قدر تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف حروف کی اجازت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہوئی اس طرح سے مکہ میں جس قدر قرآن شریف آنحضرت پر نازل ہوا وہ ایک ہی حرف پر نازل ہوا اور یہ ایسا قطعی اور یقینی نتیجہ ہے کہ کوئی دلیل اسے توڑ نہیں سکتی۔ مگر یہ امر کہ مدینہ میں کس وقت یہ اجازت ملی اسکی اس حدیث سے کچھ تعیین نہیں ہو سکتی لیکن ایک اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دراصل یہ اجازت اس وقت دیگئی جب فتح مکہ کے بعد کثرت سے عرب لوگ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے اور مختلف قوموں کو قرآن کریم کے سکھانے کی ضرورت پیش آئی جس سے اس اجازت کا زمانہ ہجرت نبوی کا نواں سال قرار پاتا ہے۔ یہ حدیث وہ ہے جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے قریباً یکساں لفظوں میں بیان کیا ہے اور جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم کے اختلاف کا ذکر ہے۔ حضرت عمرؓ نے ہشام کو قرآن شریف کی ایک سورت پڑھتے سُنا اور آپ اس کے پڑھنے سے بہت حیران ہوئے کیونکہ اسمیں انکی قرأت سے جو ہمیشہ سے حضرت عمرؓ پڑھتے اور سُنتے چلے آئے تھے بعض اختلاف تھے جس تعجب سے حضرت عمرؓ نے حضرت ہشامؓ کی اس قرأت کو سُنا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پہلا ہی موقعہ تھا جو حضرت عمرؓ کو قرأت میں ایسے اختلاف کے سُننے کا موقعہ ہوا۔ اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ہشامؓ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ پس ان کا سورۃ فرقان جیسی لمبی سورۃ پڑھنا اس کے بھی کچھ عرصہ بعد کا واقعہ ہونا چاہئیے۔ کیونکہ مسلمان ہوتے ہی وہ ایک آدھ دن میں اتنی اتنی لمبی سورتیں یاد نہ کر سکتے تھے۔ کہ نماز میں انہیں پڑھنا شروع کر دیں۔ پس اس قدر تو یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ واقعہ جس کا حدیث میں ذکر ہے فتح مکہ کے بعد کا ہے۔ اور اس کا زمانہ نویں سال ہجرت سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت برسوں پہلے ہو چکی ہو مثلاً آنحضرتؐ کی مدنی زندگی کے ابتدا میں ہی ہو چکی ہو؟ یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایسی اجازت ملی ہو اسی وقت سے اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہو۔ اور اگر مثلاً اجازت ابتدائے مدنی زندگی میں ہی مل گئی ہو اور اس پر عمل نو سال بعد تک نہ ہوا ہو تو اس میں اور اس صورت میں کہ اجازت ہی نویں سال ہجری میں ملی ہو کچھ فرق نہیں۔ پس اب تحقیق طلب یہ امر ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ قرآن شریف سات حروف پر تو ابتدائی زندگی مدنی سے ہی پڑھا جاتا ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو؟ اگر حضرت عمرؓ عرب کے کنارے کی قوموں میں سے ایک شخص ہوتے اور ایک آدھ دفعہ آنحضرتؐ کے پاس تشریف لا کر پھر اپنے گھر میں چلے گئے ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ اجازت سات حروف کی مدت سے مل چکی ہو اور اُن کو

اطلاع نہ ہوئی ہو۔ مگر حضرت عمرؓ دن رات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ اور اگر کبھی اپنے کاروبار بھی کرتے تھے اور غیر حاضری کا اتفاق ہو جاتا تو آپ نے یہ انتظام کیا ہؤا تھا۔ کہ ایک اپنے ہمسائے کو اس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیتے جو آپ کو تازہ وحی اور نئے امور سے اطلاع دیتے پس ایسے شخص کے متعلق یہ کسی صورت میں خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اگر سات حروف میں پڑھنے کی اجازت ملگئی ہو اور اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہو تو وہ برسوں یا مہینوں اس سے بیخبر رہے ہوں۔ ان تمام واقعات پر غور کرکے ہم اس یقینی اور قطعی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت نویں سال ہجرت کے قریب ہوئی جب عرب کی مختلف قومیں کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں اور اس سے پہلے یہ اجازت نہ تھی یا اگر اجازت تھی تو اس پر قطعاً عمل نہیں ہؤا۔ یعنی فی الواقع قرآن شریف کا مختلف حروف پر پڑھا جانا فتح مکہ سے پہلے ثابت نہیں ہے۔ اور جس قدر حدیثیں اس کے متعلق آئی ہیں ان سے اشارتاً اور کنایتاً بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فتح مکہ سے پہلے قرآن شریف سات حروف پر پڑھا گیا ہو۔ چنانچہ جن لوگوں نے سبعۃ احرف پر بحث کی ہے خواہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچے ہوں مگر اس امر کے وہ قائل ہیں کہ یہ اجازت اس وقت ملی جب عرب کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے لگے اور یہ فتح مکہ سے بعد کا زمانہ ہے +

آلیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔

اس ساری بحث سے ایک اہم نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے سبعۃ احرف کی حقیقت پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تیرہ سال مکہ میں اور آٹھ سال سے زیادہ مدینہ منورہ میں یعنی اکیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر نازل ہؤا اور ایک ہی طرز پر پڑھا جاتا رہا اور ایک ہی طرح پر لکھا جاتا رہا۔ نہ کوئی اختلاف تھا اور نہ قرآن شریف کی کسی عبارت میں مختلف حروف کا وجود تھا۔ یہی اصل قرآن شریف ہے جسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ساری عمر پڑھتے رہے پڑھاتے رہے یہی وہ قرآن شریف ہے جسے حضرت ابوبکرؓ نے تحریر میں جمع کرایا یہی وہ قرآن شریف ہے جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے اطراف میں بھیجیں اور یہی وہ قرآن شریف ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جس طرح اکیس سال تک کسی دوسرے حرف یا قرأت کا وجود نہ تھا اسی طرح اِس قرآن شریف میں جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ ایک ہی قرآن شریف ہے جو ساری اسلامی دنیا میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں بھی نہ کوئی اختلاف قرأت ہے اور نہ اختلاف حروف ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی عبارت وہی عبارت ہے جو اکیس سال تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں پڑھی جاتی تھی۔ پس جو قرأتیں چھوڑی گئیں وہ اصل میں قرآن شریف کا جزو نہ تھیں بلکہ ایک خاص وقت اور ایک خاص ضرورت کے لیئے ان کی اجازت دیگئی تھی۔ اس کے متعلق میں اور شہادتیں بھی پیش کرونگا۔ مگر جہانتک زمانہ اجازت کے سوال سے کوئی نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اِس سے صاف اس امر کی شہادت ملتی ہے۔ کہ اکیس سال تک مختلف حروف اور قرأتوں کا سوال ہرگز نہیں اٹھا۔ ایک ہی حرف پر قرآن شریف نازل ہوتا تھا اور ایک ہی قرات تھی۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس اکیس سال کے زمانہ میں قرآن شریف کا بہت بڑا حصہ نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریباً قریباً سارا ہی قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ پس ایک ایسے

بعد کا اختلاف صرف طرز ادا میں تھا

وقت میں جبکہ مختلف اقوام کثرت کے ساتھ دین اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں مختلف حروف میں قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دینا صاف بتا رہا ہے کہ یہ اجازت صرف انہی قوموں کی وجہ سے تھی۔ اور اس سے اصل عبارات قرآنی میں کوئی تغیر تبدل نہیں ہوا۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اختلافات حروف عبارتوں یا جملوں کے اختلاف نہ تھے بلکہ ایسے اختلاف تھے جو ایک ہی لفظ کے بولنے میں مختلف قوموں کے درمیان پیدا ہونے لازمی ہیں۔ یہ قومیں زبان تو عربی ہی بولتی تھیں مگر جیسا کہ ہر ایک زبان کا قاعدہ ہے خصوصاً جہاں علم کا عام رواج نہ ہو اور لوگ پڑھے ہوئے تھوں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اصل محاورہ سے کچھ فرق پڑ جاتا ہے ایسا ہی ان قوموں کے محاورہ میں یعنی بعض الفاظ کو ادا کرنے کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا۔ ایسے اختلافات کی بعض مثالیں پہلے بھی بیان ہو چکی ہیں۔ مثلاً لفظ حتیٰ جو اصل لفظ ہے اور محاورہ قریش کے مطابق ہے اسے ثقیف اور ہذیل عتیٰ پڑھتے تھے ایسے ہی اور بعض اختلافات کی مثالیں دی گئی ہیں (دیکھو فتح الباری) مثلاً اسدی تعلمون ت کے کسر کے ساتھ پڑھتے تھے بعض قومیں ماء غیر اسن کی جگہ ماء غیر یاسن پڑھتی تھیں اور ایسا ہی بعض قومیں ایسے الفاظ میں ہمزہ پڑھتی تھیں جہاں دوسری نہ پڑھتی تھیں۔ یہ سارے ایسے فرق ہیں جو ہر جگہ پر اور ہر زبان میں اختلاف محاورہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی کی تائید میں بعض اور شہادتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ فتح الباری میں یہ مذکور ہے۔ ونقل ابو شامۃ عن بعض الشیوخ انہ قال انزل القرآن اولا بلسان قریش ومن جاورھم من العرب الفصحاء ثم ابیح للعرب ان یقرؤہ بلغاتھم التی جرت عادتھم باستعمالھا علی اختلافھم فی الالفاظ والاعراب ولم یکلف احد منھم الانتقال من لغتہ الی لغۃ اخری للمشقۃ ولما کان فیھم من الحمیۃ ولطلب تسھیل فھم المراد کل ذلک مع اتفاق المعنی۔ یعنی ابو شامہ نے ایک بزرگ سے یہ نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اول نزول قرآن کریم کا زبان قریش میں اور ان فصیح عربوں کی زبان میں تھا جو اُن کی ہمسائیگی میں رہتے تھے پھر دوسری عرب قوموں کے لئے یہ اجازت دیگئی کہ اسے اپنی لغات یعنی محاورہ میں جس کے استعمال کے وہ شروع سے عادی تھے پڑھ لیا کریں۔ بوجہ ان کے اختلاف کے الفاظ میں و اعراب میں اور ان میں سے کسی کو اس بات پر مجبور نہ کیا گیا کہ وہ اپنے محاورہ کو چھوڑ کر دوسرے کا محاورہ اختیار کرے۔ اسلئے کہ ایسا کرنا ان کے لئے بہت دشوار تھا۔ اور ان میں اپنے اپنے محاوروں کے لئے حمیت بھی تھی۔ اور اس سے معنوں کے سمجھنے میں بھی ان کے لئے آسانی تھی۔ اور یہ سب کچھ اتفاق معنی کے ساتھ تھا یعنی یہ اختلاف محاورہ ان کے ایسے نہ تھے جن سے معنوں میں کچھ بھی فرق پڑتا ہو۔ یہ نقل بھی ہمارے اس نتیجہ کی مؤید ہے جو زمانہ اجازت قرأت حروف مختلفہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اجازت کی غرض صرف سہولت دینا تھا

اگر ان احادیث پر جو اُن سبعۃ احرف کے متعلق نقل کی گئی ہیں غور سے نظر کیجاوے تو ان سے بھی اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ اس اجازت کے دینے کی غرض کیا تھی۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ھون علی امتی۔ میری اُمت پر آسانی کر جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ بعض لوگوں کو

قریش کے محاورہ میں سارے الفاظ ادا کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں ان کے لیئے آسانی کی درخواست کی کہ وہ اپنے محاورہ میں ہی ان الفاظ کو ادا کر لیں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا ان امتی لا تطیق ذٰلك یعنی میرے لوگ اس بات کی برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ سب ایک ہی حرف میں قرآن شریف کو پڑھ سکیں۔ ایک تیسری حدیث میں ہے۔ کہ آپ نے فرمایا ان لوگوں میں بعض بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں اور بچے اور ناخواندہ لوگ ہیں۔ غرض یہ تھی کہ لوگ ایسے اپنے محاورہ کے عادی ہو گئے ہیں کہ دوسرے محاورہ میں الفاظ ادا نہیں کر سکتے جس طرح ایک لفظ بولنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اسی طرح پر اسے بول سکتے ہیں۔ اگر وہ تعلیمیافتہ ہوتے تو قریش کی فصیح اور علمی زبان میں ہر ایک لفظ کو آسانی سے ادا کر سکتے۔ مگر چونکہ اُمّی لوگ تھے ایسا نہ کر سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو تکلیف میں نہ ڈالا۔ بلکہ یہ اجازت دی کہ جس طرح وہ کسی لفظ کو بولنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اسی طرح پڑھ لیا کریں۔ اور بخاری کی حدیث کے آخری الفاظ ہیں فاقرؤا ما تیسر منہ یعنی جس طرح پر تمہارے لیئے آسانی ہو اسی طرح پڑھ لیا کرو۔ اس سے بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر ایک پانچویں حدیث میں ہے کہ اعرابی اور عجمی سب لوگ قرآن پڑھ رہے تھے اور آپ نے فرمایا سب ہی خوب پڑھ رہے ہیں۔ اور آپ نے ایسی قوم کی مذمت کی۔ جو لفظوں کو تو بہت سنوار سنوار کر ادا کر دینگے مگر معنوں تک نہیں پہنچیں گے +

ایک اور بات جس سے سبعۃ احرف کی بحث پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ جو لوگ ابتدائے اسلام میں مشرف باسلام ہوئے تھے ان میں اس قسم کے اختلافات کا کچھ تذکرہ نہیں پایا جاتا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم میں کوئی اختلاف قرأت نہیں دکھایا جا سکتا۔ مسلمانوں میں سے سابقین کے اندر ایسے اختلافات کا نہ پایا جانا بھی صاف طور پر یہی بتا رہا ہے کہ اجازت مختلف حروف میں پڑھنے کی خاص اغراض کیلیئے تھی۔ اور اس سے اصل عبارت قرآنی میں کوئی تغیر تبدل نہیں ہوا۔ قرآن کریم کا نزول لسان قریش میں ہوا کیونکہ انہی کی زبان علمی اور پُر از فصاحت و بلاغت سمجھی جاتی تھی۔ دوسری قوموں کے محاورے محض اسی اصل زبان کا کسی کسی لفظ میں بگاڑ تھا۔ مگر ان لوگوں کے لیئے جو ایسے الفاظ کو اپنی قوم کے محاورہ کے مطابق ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان الفاظ کو زبان قریش کے محاورہ میں ادا کرنا بہت مشکل تھا اور چونکہ ہر ایک مسلمان کے لیئے کچھ نہ کچھ حصہ قرآن کریم کا جاننا ضروری تھا خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ اور خواہ بوڑھا ہو یا بچہ۔ کیونکہ نماز ہر ایک مسلمان پر فرض تھی اور نماز میں قرآن شریف لازمی طور پر پڑھا جاتا تھا۔ اسلیئے ان لوگوں کو جو یکایک اپنے محاوروں میں اس قسم کا تغیر پیدا کرنے کے ناقابل تھے کہ ہر ایک لفظ کو صحیح طور سے قریش کے محاورہ پر ادا کر سکیں یہ اجازت دیگئی جس کی بناء وحی الٰہی پر تھی کہ وہ بعض الفاظ کو اُسی طور پر ادا کر لیں جس طرح اپنے محاورہ میں کرتے تھے +

اختلاف قاصر و نہایت ضعیف تھے +

یہ سوال کہ مختلف محاورات یا لغتیں محاورہ قریش سے اور آپس میں کس قدر مختلف تھیں اب اس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جیسا کہ کئی مثالیں دے کر پہلے بھی بیان کیا گیا ہے یہ اختلافات

نہایت خفیف تھے۔ تاریخی شہادت جہاں تک میسر آسکتی ہے وہ بھی اس نتیجہ کی مؤید ہے لیکن ساتھ ہی اس کے ہم اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ جیسا کہ ایسے محاورات میں بعض اوقات ہو جاتا ہے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ان کا قائم مقام دوسرے محاورہ میں کوئی اور لفظ ہوتا ہے۔ اسلئے جب قرآن کریم کو دوسرے حروف پر یعنی دوسرے محاوروں کے مطابق پڑھنے کی اجازت دیگئی ہوگی۔ تو اس طرح سے کسی لفظ کو دوسرے محاورہ میں اسکے ہم معنی لفظ سے ادا کرنے کی اجازت بھی دیدیگئی ہوگی۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ مختلف حروف سے مراد ایک معنی کو مختلف الفاظ سے ادا کرنا ہے۔ اگرچہ یہ انہوں نے محض قیاس سے لکھا ہے اور حضرت عمرؓ اور ہشام والی حدیث سے دھوکہ کھایا ہے لیکن ممکن ہے کہ ایسی کوئی مثال بھی ان کے ذہن میں ہو۔ کہ ایک محاورہ میں ایک لفظ کو دوسرے محاورہ میں اس کے ہم معنی لفظ سے جہاں پہلا لفظ اس دوسرے محاورہ میں موجود نہ ہو ادا کرنے کی اجازت دیگئی اور اس سے انہوں نے ایک عام قاعدہ بنا لیا بعلاوہ ان مثالوں کے جو اوپر بیان ہوئیں اور ظاہر کر رہی ہیں۔ کہ اختلاف احرف عموماً نہایت خفیف اختلاف تھے جو بعض الفاظ کو خاص طرز پر ادا کرنے کی وجہ سے یا اعراب میں کسی قدر فرق کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے خود قیاس بھی اس بات کو چاہتا ہے کہ یہ اختلاف ایسے ہی معمولی اختلاف تھے جیسے ایک ہی ملک کے رہنے والے اور ایک ہی زبان کے بولنے والے لوگوں میں بعض وقت پائے جاتے ہیں۔ آخر ان سب قوموں کی زبان عربی ہی تھی۔ اور اسی زبان میں وہ شعر کہتے تھے جن میں باہم ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے۔ اور باہمی ان کا میل جول بھی بہت ہوتا تھا اور میلے لگا کرتے تھے جہاں وہ سب اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں اسی نتیجہ کی مؤید ہیں کہ اختلاف احرف نہایت خفیف قسم کے اختلافات تھے +

اعتراض اس پر یہ کیا گیا ہے کہ اگر واقعی یہ اختلاف ایسے ہی خفیف ہوتے تو صحابہؓ ان اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر سختی کیوں کرتے جیسا کہ مثلاً حضرت عمرؓ کے متعلق حدیث میں مذکور ہے کہ انہوں نے اول تو نماز میں ہی ہشام کو روکنا چاہا اور پھر آخر ان کی گردن میں چادر ڈال کر ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں لے گئے اور جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم نہیں دیا تب تک نہیں چھوڑا انہیں۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عمرؓ اور ہشام کی قرات میں کوئی بہت بھاری اختلاف ہوگا جس سے معنوں میں بھی تغیر آتا ہوگا جو حضرت عمرؓ نے ہشام کے ساتھ اس قدر سختی کا برتاؤ کیا جیسے کسی بڑے مجرم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض نادان یا مجنون معترض تو یہاں تک کہنے کیلئے تیار ہو گئے ہیں کہ ہشام کی قرأت حضرت عمرؓ کی قرأت سے اس قدر اختلاف رکھتی تھی کہ دونوں گویا الگ الگ عبارتیں تھیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہوتا تو حضرت عمرؓ کو یہ کیونکر پتہ لگ گیا کہ حضرت ہشام سورہ فرقان پڑھ رہے ہیں جیسا کہ انہوں نے ان کی قرأت کو سنتے ہی پہچان لیا۔ رہی یہ بات کہ اس قدر اختلاف تھا جس سے معنوں میں بھی اختلاف ہوا ہوگا ورنہ حضرت عمرؓ سختی نہ کرتے۔ یہ قیاس بھی غلط ہے کیونکہ احادیث میں صریح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں کہ یہ اختلاف قرأت ایسا نہ تھا جس سے معنوں میں بھی کچھ اختلاف ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن شریف کے ایک ایک لفظ اور حرف اور حرکت کے لئے ایسے محتاط تھے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ فرق کو بھی وہ

برداشت نہ کر سکتے تھے انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ قرآن شریف کے معنے سمجھ لینے ہی کافی ہیں بلکہ وہ اس کے الفاظ اور حروف اور حرکات کو منجانب اللہ سمجھ کر اور خدا کا کلام یقین کر کے محافظت کرتے تھے پس وہ اسی قدر ادنے اختلاف کو بھی جو اختلاف حروف سے پیدا ہوا برداشت نہ کر سکے۔ جب تک آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سن نہیں لیا کہ یہ اجازت محض ایک ضرورت کے لئے دی گئی ہے انہوں نے صبر نہ کیا جب تک کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ سمجھا نہیں دیا کہ ان قوموں کیلئے جو الگ محاورہ بولتی ہیں بعض الفاظ کا قریش کے محاورہ پر ادا کرنا سخت مشکل ہے۔ اسلیئے خود اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ دوسرے حروف یعنے محاوروں میں بعض الفاظ کو پڑھ لیں۔ غرض کہ حضرت عمرؓ کی ناراضگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت تک ان کو یہ علم نہیں تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے حروف پر قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت بھی دی ہے۔ اسلیئے وہ کسی تھوڑے سے تغیر و تبدل کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے +

حضرت عمرؓ اور ہشامؓ کا اختلاف

ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور ہشام دونوں ایک ہی قبیلہ کے تھے پس اگر اختلاف حروف محض اختلاف محاورہ سے ہی پیدا ہوتے تو حضرت عمرؓ اور ہشام کی قرأت میں کچھ فرق نہیں ہونا چاہئے تھا حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ ان میں اختلاف ہوا اس سے ہمارے بعض علما نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اختلاف حروف سے مراد ایک ہی معنی کا مختلف الفاظ سے ادا کرنا تھا اور بعض معترضین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اختلاف حروف قرآن شریف کی عبارتوں کا اختلاف تھا۔ مگر محض عمرؓ اور ہشام کے ہم قبیلہ ہونے اور پھر اختلاف قرات کے ہو جانے سے ایسے نتائج نکالنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ اوّل تو اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب بذریعۂ وحی سات حروف پر قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت ہو گئی تو یہ اجازت خاص خاص اقوام سے مخصوص نہ رہ سکتی تھی۔ قرآن کریم ایک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی تمام صحابیوں کو نہ سکھاتے تھے بلکہ بعض صحابی بھی بعض کو سکھاتے تھے اور اس طرح ایک قوم کی خصوصیات دوسری قوم میں جا سکتی تھیں۔ دوئم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگر ایک قوم ایک لفظ کو ایک خاص طرز پر جو دوسری قوم میں مروج ہے ادا نہ کر سکے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ دوسری قوم بھی پہلی قوم کی طرز پر اس لفظ کو ادا نہیں کر سکتی۔ یہ بات مثال سے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاویگی۔ ہذیل اور ثقیف حتیٰ کی بجائے عتیٰ پڑھتے تھے۔ حتیٰ قریش کے محاورہ میں تھا اور اس کی بجائے ان کے محاورہ میں عتیٰ تھا۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ قریش عتیٰ نہ بول سکتے تھے۔ اگرچہ عام طور پر وہ حتیٰ ہی بولتے تھے اور یہی اصل لفظ تھا۔ مگر وہ اگر چاہتے تو عتیٰ بھی پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث سے ثابت ہے کہ ابن مسعودؓ حتی حین کی بجائے بموجب محاورہ ہذیل و ثقیف عتیٰ حین پڑھتے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان کو منع بھی کیا تھا کہ ہذیل کی لغت میں قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھاؤ۔ اصل بات یہ تھی کہ قریش دوسری اقوام کے محاورات کے مطابق الفاظ کو ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے کیونکہ مکہ معظمہ میں جو ان کا صدر مقام تھا مختلف قوموں کے لوگ ہر سال موسم حج میں اور میلوں وغیرہ پر جمع ہوا کرتے تھے۔ اور قریش کو چونکہ ہر ایک قوم اور قبیلہ سے لین دین اور تجارت کا واسطہ پڑتا تھا۔ اور علاوہ ازیں علمی مناظرے

اور مقابلے بھی باہمی ہوتے رہتے تھے۔ اسلیئے قریش کو ہر ایک قوم کے محاورہ سے واقفیت پیدا کرنی لازمی ہو گئی تھی۔ اب ہشام جب مسلمان ہوئے تو یہ وہ وقت تھا جب فتح مکہ کے بعد فوج در فوج عرب کی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں۔ اور غالباً حضرت ہشام نے سورۃ فرقان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسے وقت سُنا جب آپ کسی قوم کو پڑھا رہے تھے۔ اور اسی طرح پر انہوں نے یاد کر لیا اور چونکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت تھی کہ فاقرءوا ما تیسر منہ یعنی جس طرح آسان ہو اسی طرح پڑھ لو اسلیئے حضرت ہشام نے قریش کے محاورہ کے مطابق اسے ادا کرنے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس طرح پر پڑھنے سے منع فرمایا جس طرح وہ پڑھ رہے تھے۔ ان واقعات سے ناظرین آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ہشام اور حضرت عمرؓ میں باوجودیکہ دونوں ایک ہی قبیلہ کے تھے اختلاف ہوا۔ حضرت عمرؓ اس زمانہ میں قرآن شریف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھ چکے تھے جب ایک ہی حرف پر قرآن شریف پڑھا جاتا تھا۔ اور ہشام نے ایسے وقت سیکھا جب دوسری قوموں کے اسلام میں کثرت کے ساتھ داخل ہونے سے ان کو ان کے اپنے محاورہ کے مطابق ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن شریف پڑھانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ لیس یہی وجہ اختلاف کی تھی ✦

سات حروف سے کیا مراد ہے

سات حروف میں پڑھنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کا ہر ایک لفظ سات طرز پر پڑھا جاتا تھا۔ بلکہ مطلب قرآن شریف کے سات حروف پر اُتارا جانے کا صرف یہ ہے کہ جن محاورات میں پڑھے جانے کی اجازت تھی وہ سات تھے یا یوں کہو کہ ایک لفظ کی مختلف قرأتیں جو اختلاف محاورہ سے پیدا ہوتی تھیں وہ سات لغتوں میں سے ایک میں ہوتی تھیں۔ یہ اختلافات تعداد میں بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ حدیث میں جس قدر اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اگر اختلافات بہت سے ہوتے تو احادیث میں ضرور ان کا ذکر زیادہ ہوتا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ بہت سی قرأتیں بعض مفسرین اس وقت بھی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ قرأتیں اور سبعۃ احرف ایک چیز نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ سبعۃ احرف کی قرأتیں بہت تھوڑی اسلیئے ہم تک پہنچی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ان کا قرآن شریف میں لکھنا بند کر دیا تھا۔ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ جو چیزیں احادیث میں محفوظ ہو کر آئی ہیں ان میں سے کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی۔ اور ہزارہا واقعات بغیر معرض تحریر میں کبھی آنے کے احادیث میں پوری طرح سے محفوظ رہے۔ اختلافات کے کم ہونے کی وجہ ان قوموں کا باہمی میل جول تھا۔ جو اکثر میلوں مجلسوں مشاعروں اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ ہوتا رہتا تھا۔ اور انہی تعلقات کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے اختلاف نہ بڑھنے پاتے تھے سات لغات جن میں قرآن شریف کے بعض الفاظ کو ادا کرنے کی اجازت دیگئی تھی وہ تھیں جو عرب میں افصح ترین تھیں۔ مگر بعض کا خیال یہ ہے کہ سات سے انحصار تعداد مقصود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ علاوہ محاورہ قریش کے جس میں قرآن شریف کا نزول ہو رہا تھا کچھ اور محاورات بھی ایسے تھے جن میں بعض الفاظ قرآنی کو ادا کرنے کی اجازت دیگئی تھی ✦

جس قدر بحث اوپر ہو چکی ہے اس سے ایک بے تعصب انسان کے دل کو تسکین دینے والی شہادت اس امر کی ملتی ہے

آنحضرت نمازوں میں قرآن شریف کو نزول اول کے مطابق ہی پڑھتے رہے اور ایک ہی حرف پر لکھواتے رہے

کہ وہ اختلافات قرأت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سبعۃ احرف سے پیدا ہوئے تھے وہ قرآن کریم کا جزو نہ تھے نہ اسکی اصل عبارتوں میں داخل تھے بلکہ جو ضرورت اُن کی اجازت کے لیئے پیدا ہوئی تھی وہ ایک مقامی ضرورت تھی اور تھی بھی عارضی - قریباً کُل کا کُل قرآن شریف اس اجازت سے پہلے نازل ہوچکا تھا جس قدر زیادہ غور ان قرأتوں پر ہم کرتے ہیں اسی قدر زیادہ اطمینان اس نتیجہ کے متعلق حاصل ہوتا ہے کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت محض بعض قوموں کی آسانی کے لیئے تھی - اور اس سے اصل قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا بلکہ قرآن شریف وہی تھا اور ہمیشہ وہی رہا ہے جو ابتدا سے نازل ہوا تھا - یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خود جب نماز جماعت میں قرآن شریف پڑھتے تھے تو آپ بھی ان حروف میں نہ پڑھتے تھے جن میں بعض دوسرے لوگ پڑھ لیتے تھے بلکہ آپ ہمیشہ قرآن شریف کو اسی طرح نمازوں میں پڑھتے رہے جس طرح یہ اصل میں نازل ہوچکا تھا - اس نتیجہ کو ان واقعات سے بھی تائید ملتی ہے کہ حضرت اُبی اور ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم جیسے صحابیوں نے جب کسی دوسرے حرف پر قرآن شریف کسی کو پڑھتے سُنا تو وہ بہت متعجب ہوئے اور گھبرائے کیونکہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نمازمیں ان دوسرے حروف میں سے کسی پر قرآن شریف پڑھتے تو ان جلیل القدر صحابہ کو جو اکثر پانچوں نمازیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے تھے خود اطلاع ملجاتی اور پھر دوسرے لوگوں کو پڑھتے سنکر انہیں تعجب نہ آتا - پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے کہ نمازوں میں آپ قرآن شریف کو اسی طرح پڑھتے رہے جس طرح وہ کلام پاک ابتداء میں نازل ہوچکا تھا یہ ثبوت ملتا ہے کہ دوسرے حروف کی غرض محض ایک خاص غرض تھی اور اس سے اصل عبارت قرآنی میں نہ کوئی کمی بیشی ہوئی اور نہ کوئی تغیر تبدل ہوا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ایک اور شہادت بھی اسی کی مؤید ہمیں ملتی ہے - اور وہ یہ ہے کہ آپ قرآن شریف کو جب لکھواتے تھے تو تب بھی اسی نزول کے مطابق لکھاتے تھے جو قرآن کریم کا پہلا اور اصلی نزول تھا - اور جو حصص قرآن کریم کے سبعۃ احرف کی اجازت کے بعد بھی نازل ہوئے تو وہ بھی آپ نے لسان قریش کے مطابق ہی لکھائے کیونکہ اصل نزول قرآن شریف کا اسی زبان میں تھا یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کریم کے کام پر مامور کیا تو ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ اصلی تحریریں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی ہوں انہیں اکٹھا کریں - کیونکہ وہ مطمئن تھے کہ ان تحریروں میں قرآن شریف کسی دوسرے حرف کے مطابق نہیں لکھا گیا بلکہ جس طرح پر قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کا منشاء وحیٔ الٰہی کا تھا اسی طرح پر لکھا گیا ہے - اور دوسرے حروف کو آپ نے تحریروں میں کوئی دخل نہیں دیا مگر ایسے تو ایسا ممکن تھا کہ باوجود قریش ہونے کے ان میں سے کسی نے کوئی دوسرا حرف کسی موقع پر اختیار کرلیا ہو جیسا کہ ابن مسعود کے حال سے معلوم ہوتا ہے مگر تحریر میں یہ بات ممکن نہ تھی - پس ایک طرف تحریر میں قرآن شریف کو اسی طرح محفوظ رکھنا جو اس کا پہلا نزول تھا اور دوسری طرف خود نمازوں میں اسی قرأت کو پڑھنا جو پہلے نزول کے مطابق تھی یعنی لسان قریش میں یہ دو اور نہایت زبردست شہادتیں اس بات پر ہیں کہ مختلف حروف

قرآن شریف باوجود اختلاف حروف کے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہا۔

کی اجازت دینے سے آپ کا یہ منشاء کبھی تھا اور نہ ہی وحی الٰہی کا یہ منشاء تھا کہ وہ دوسری قرأتیں بھی ہمیشہ کیلئے جزو قرآن سمجھی جاویں۔ بلکہ وہ ایک خاص ضرورت تھی اور اصل الفاظ قرآنی وہی تھے جنمیں شروع سے یہ پاک کلام نازل ہو رہا تھا

اِس قدر بحث کے بعد اب ہم اعتراض اوّل پر غور کرتے ہیں جس کا ذکر شروع مضمون میں کیا گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مختلف حروف یا قرأتوں کی اجازت دی اُن کی حقیقت ہم کھول کر بیان کر چکے ہیں۔ اور نیز یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ یہ صرف ایک وقتی ضرورت کیلئے تھی اور آنحضرت صلعم نے کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ انکو تحریر میں لایا جاوے نہ ہی کبھی خود جماعت کراتے وقت اِن قرأتوں کو اختیار کیا گیا گو آپ پر وہ نازل ہوئی تھیں علاوہ ازیں باوجودیکہ قرآن کو سات حروف میں پڑھنے کی اجازت وحی الٰہی سے تھی اور ان سب قرأتوں کو نازل شدہ ہی بیان کیا گیا ہے مگر پھر بھی قرآن شریف کے متعلق عام طور پر یہی کہا جاتا تھا کہ قرآن کریم لسان قریش میں نازل ہوا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے ابن مسعود کو لکھا تھا کہ قرآن شریف کو لغت ہذیل میں مت پڑھاؤ کیونکہ نزول قرآن شریف کا لسان قریش میں ہے! اب عمر خوب اس بات سے اطلاع رکھتے تھے کہ سات حروف پر قرآن شریف کا نزول ہوا ہے کیونکہ خود انہی کو حضرت ہشام کے ساتھ اختلاف کا واقعہ بھی پیش آیا تھا پھر باوجود اسکے یہ لکھنا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے اسکو لغت ہذیل میں مت پڑھاؤ کیا معنے رکھتا ہے؟ ہر ایک عقلمند سوچ سکتا ہے کہ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے ایسے جلیل القدر صحابہؓ خوب سمجھتے تھے کہ دیگر حروف میں نزول سے کیا مراد ہے اور کہ وہ ایک خاص وقت اور خاص ضرورت کے لحاظ سے ہے! اور اس سے اصل نزول قرآنی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اسی طرح پر جب حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے نسخے بغرض اشاعت بلاد متفرق لکھوانے شروع کئے تو آپ نے بھی کاتبوں کو یہی ہدایت دی کہ جب کسی لفظ کی طرز تحریر میں اختلاف ہو (کیونکہ کتابت پر کئی شخص مامور تھے) تو اسے لسان قریش میں لکھا جاوے۔ کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ حضرت زیدؓ مدینہ کے رہنے والے تھے اور انکی طرز تحریر ممکن تھا کہ کہیں قریش سے اختلاف رکھتی ہو جیسا کہ ان نسخوں کے لکھتے وقت بھی تابوت کی طرز تحریر پر اختلاف ہوا اور آخر اسی طرز پر یہ لفظ لکھا گیا جس طرح قریش لکھتے تھے اور فیصلہ کرتے وقت پھر حضرت عثمانؓ نے یہی فرمایا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ اور تمام صحابی اس میں ان کے ساتھ متفق تھے کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان تمام صحابہؓ کو یہ پتہ نہ تھا کہ قرآن شریف کا نزول بعض دیگر حروف پر بھی ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس بات کو جانتے تھے کہ دیگر حروف میں قرآن شریف کے کسی لفظ کے پڑھے جانے سے کیا مطلب ہے اور اسکی کیا ضرورت ہے۔ اور اسی لئے آپ نے نہ عام نمازوں میں کبھی دوسرے حرف کی قرأت کو اختیار کیا نہ تحریر میں اس کو آنے دیا اسیطرح پر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی ان اختلافات حروف کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ قرآن شریف جس طرح دیگر حروف کی اجازت سے پہلے ایک ہی تھا۔ اسی طرح اس اجازت کے بعد بھی ایک ہی رہا اور اس میں کوئی فرق کوئی تغیر تبدل نہیں ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی صحابی نے خیال نہیں کیا کہ دیگر حروف میں قرآن شریف کے نزول سے نزول اول میں جو لسان قریش میں تھا کچھ ایزادی ہو گئی ہے یا کچھ تغیر تبدل ہو گیا ہے۔ پس وہی قرآن شریف

آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جو دیگر حروف کی اجازت سے پہلے تمام صحابہ رضؓ پڑھتے اور لکھتے تھے اور جو دیگر حروف کی اجازت کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نمازوں میں پڑھا اور لکھوایا۔ اسی قرآن شریف کو حضرت ابوبکرؓ نے جمع کرایا اور کوئی قرأت دوسرے حروف کی اس میں اس وقت بھی درج نہیں کی گئی نہ ہی کسی صحابی نے اس وقت یہ اعتراض کیا پھر اسی سے حضرت عثمانؓ نے نقلیں کرائیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ والے صحف میں دوسرے حرف کی کوئی قرأت نہ تھی تو حضرت عثمانؓ نے یہ حکم کیوں دیا کہ جب جماعت قریش اور زید بن ثابت کسی بات میں اختلاف کریں تو اسے لسان قریش میں لکھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں طرز تحریر کا ذکر ہے نہ قرأت کا چونکہ اول لکھنے والے زید رضی اللہ عنہ تھے اور وہ مدنی تھے قریش نہ تھے۔ اسلیئے اب جو قرآن شریف لکھا گیا جسکی اشاعت تمام بلاد میں ہونی تھی تو اس میں یہ احتیاط بھی کرلی گئی کہ طرز تحریر قرآن کریم کا بھی بالکل قریشی طرز پر ہو۔ چنانچہ ایک ہی اختلاف جو اس وقت زید بن ثابت اور قریشیوں میں ہؤا وہ جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے لفظ تابوت کی طرز تحریر کے متعلق تھا۔ لفظ تابوت اس سورت میں واقع ہوتا ہے جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور یہ وقت تھا جب حضرت زیدؓ کاتب الوحی کا کام کرتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے اپنی طرز پر لکھ لیا۔ مکی سورتوں میں کسی ایسے اختلاف طرز تحریر کا ذکر نہیں۔ کیونکہ وہاں لکھنے والے سب ہی لوگ تھے جو قریش میں سے تھے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید نے تمام اصلی تحریریں اکٹھی کی تھیں۔ اس قدر اور بھی دوبارہ بیان کردینا ضروری ہے کہ یہ اختلاف جو لفظ تابوت کی طرز تحریر کے متعلق پیدا ہؤا صرف اس قدر تھا کہ یہ لفظ لمبی ت کے ساتھ لکھا جاوے یا گول ۃ کے ساتھ۔ اس سے قرات کا اختلاف ہرگز ثابت نہیں ہوتا +

حضرت عثمانؓ کی کارروائی مطابق منشاء نبی کریم اور حفاظت قرآن کے لئے تھی

اب ہم قطعی اور یقینی شہادت کی بناپر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان ٹکڑوں کو جلانے کا حکم دینے سے جو بے احتیاطی سے کسی صحابی نے کسی دوسرے حرف پر لکھ لیئے ہوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی حصہ قرآن شریف کا نہیں جلایا یا ضائع کیا۔ اگر انہوں نے اختلاف حروف کو قطعی طور پر نیست و نابود بھی کردیا تو بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے قرآن شریف کے ایک حصہ کو ضائع کردیا کیونکہ یہ حروف قرآن شریف کا جزو کبھی نہیں تھے۔ اور اسلیئے کسی ایسے لفظ کے مروج نہ رہنے سے جو قرآن شریف کا جزو کبھی نہ تھا یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن شریف کا ایک حصہ گم ہوگیا یا تاویل القرآن کے مجنون معترض کی طرح یہ بڑھا کہنا کہ قرآن شریف کا ایک بہت بڑا حصہ ساقط ہوگیا اور جو کچھ رہگیا وہ اسکی یادگار ہے پرلے درجہ کی نادانی اور حماقت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے کونسی نئی کارروائی کی؟ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے بھی کیا تھا۔ اگر دیگر حروف کی قرأتیں قرآن شریف کا جزو تھیں تو آنحضرت نے خود یہ حکم کیوں نہ دیا کہ جس طرح کاتب اصل نزول قرآن کریم کو لکھتے ہیں اسی طرح دیگر حروف کی قرأتوں کو لکھیں؟ کیوں نمازوں میں جماعت کراتے وقت کبھی کسی حرف کی قرأت اور کبھی کسی کی قرأت نہ پڑھی؟ پھر حضرت ابوبکرؓ نے جب تحریری جمع قرآن کا حکم دیا تو کیوں انہوں نے یا کسی صحابی نے یہ تجویز پیش نہ کی کہ ساتوں حروف پر الگ الگ قرآن شریف جمع ہونے چاہئیں یا ساتوں حروف کی قرأتیں ایک ہی مجموعہ میں داخل کیجاویں؟ کیوں اصل تحریریں جمع کرنے کا

حکم دیا گیا ہے جس سے یہ غرض تھی کہ مجموعہ صحف میں کوئی دیگر حروف کی قرأت داخل نہ ہو جائے۔ پھر حضرت عمرؓ کو دیکھا جاتا ہے تو وہ بھی ابن مسعود کو لکھتے ہیں کہ ہذیل کی لغت پر قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھائیے۔ کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ پس انہی کے نقش قدم پر حضرت عثمانؓ چلے اور انہوں نے بھی حروف مختلفہ کی قرات کو قرآن شریف میں داخل نہ ہونے دیا۔ ہاں ساتھ یہ بھی اہتمام کیا کہ جو ایسے نسخے لوگوں نے خود لکھ لیئے تھے جن میں بعض دیگر حروف کی قراتیں لکھ لی تھیں یا کوئی اور غلطی ہو گئی تھی کیونکہ کافی احتیاط نہ کی تھی ان تمام نسخوں کو جلا دیا جائے اور اس طرح کرنے میں بھی انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے منشاء کو پورا کیا۔

جو واقعات اس وقت پیش آئے اور جن کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے یہ کارروائی کی وہ تفصیلاً دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ اسلام اس زمانہ میں عرب سے باہر دور دراز ملکوں میں پھیل چکا تھا۔ اور بلاد متفرقہ کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کو قرآن کریم سکھانا عرب کی اقوام کو ابتدائے اسلام میں قرآن کریم سکھانے سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔ عرب کے لوگوں کی تو بولی ہی عربی تھی اور اُن کے لیے قرآن کریم سیکھنا ایک آسان امر تھا مگر اس آسانی کے ساتھ ابتدا میں ایک مشکل بھی ملی ہوئی تھی۔ اور وہ یہ کہ بعض ان اقوام کے لہجے الگ تھے اور وہ لوگ بچپن سے بعض الفاظ کو خاص طرح پر پڑھنے کے عادی ہو گئے تھے اور یکایک اپنے لہجہ اور طرز ادا میں تبدیلی کرنا ان کے لیئے سخت مشکل تھا۔ مگر جو عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے ان کیلئے نہ تو عربی بولی کی آسانی تھی اور نہ ہی ان جیسی مشکل تھی۔ ان کے لیئے قرآن کریم کے پڑھنے کے لیے عربی زبان کا سیکھنا بھی ضروری تھا۔ مگر اس طرح پر سیکھنے میں ان کیلئے یہ برابر تھا کہ لسان قریش پر پڑھنا سیکھیں یا کسی دوسرے حرف پر۔ اب بعض صحابی جو بعض الفاظ کو کسی دوسرے حرف پر ادا کر لیتے تھے انہی دوسرے حروف پر ان عجمیوں کو بھی قرآن شریف سکھانے لگے۔ اور چونکہ عجمی لوگ اسباب سے تو ناواقف تھے کہ ان اختلافات کی اصل وجہ کیا ہے۔ اور کس ضرورت کے لیئے یہ اجازت دی گئی تھی ان کے درمیان ان قرأتوں پر اختلاف ہونے لگے یہاں تک کہ یہ اختلاف بہت بڑھے اور بعض بعض کی تکفیر اسی وجہ پر کرنے لگے۔ یہ وہ حالت تھی جسے دیکھ کر حذیفہ رضی اللہ عنہ گھبرائے اور حضرت عثمانؓ کے پاس آکر ذکر کیا کہ اختلاف کی کیا حالت ہو گئی ہے اور اس سے کیا کیا بد نتائج پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور یہی صلاح قرار پائی کہ جو نسخے ایسے خود لوگوں نے لکھ لیئے ہیں جن میں کہیں دوسرے حروف کی قرات بھی داخل ہو گئی ہے۔ ان کی اشاعت بند کر دیجاوے۔ تاکہ ان اختلافات کا سرے سے ہی قلع قمع ہو جاوے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا خود بھی یہ منشا کبھی نہ تھا کہ دوسرے حروف کی قراتیں ہمیشہ مروج رہیں۔ وہ ایک خاص ضرورت تھی جو اس وقت رفع بھی ہو چکی تھی کیونکہ ان قوموں کے اسلام پر قریب چودہ پندرہ سال گذر چکے تھے۔ اور وہ بھی اس قابل تھے کہ لسان قریش کے مطابق جس میں قرآن کریم کا اصل نزول تھا کلام الٰہی کو پڑھ سکیں۔ اور نئی نسل تو شروع سے جس طرح عادی کیجاوے ہو سکتی تھی۔ سو واقعات پیش آمدہ پر غور کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا کہ قرآن شریف کے نسخے بڑی احتیاط کے ساتھ اجلہ صحابہؓ کی نگرانی میں لکھوائے جائیں اور سوائے صحف ابی بکر کے جس سے نقلیں کرائی گئی تھیں باقی تمام نسخے جلا دیئے جائیں۔ پس دوسرے نسخوں کے جلانے سے اصل غرض حضرت عثمانؓ

کی قرآن کریم کی حفاظت تھی تاکہ وہ غلطیاں جن کا بے احتیاطی سے لکھے ہوئے نسخوں میں راہ پا جانا ممکن تھا اور ایسا ہی بعض دوسری قرأتیں جو کسی صحابی نے غلطی سے قرآن کریم کے اندر داخل کر دی ہوں قرآن کریم میں مل نہ جائیں پس حضرت عثمان کا فعل حفاظت قرآن کریم کا ممد تھا۔ جبتک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر حروف کی قرأتوں کو قرآن کریم کے اندر داخل کرنے اور لکھنے کا حکم دیا تھا اس وقت تک حضرت عثمان کے فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا +

ایک ہی قرآن پر سب کا اتفاق

اب ہم دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں۔ اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض قرأتیں جو مفسرین اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں ان کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل الفاظ قرآن کریم کے کونسے ہیں اور دوسری قرأتیں کونسی۔ قبل اس کے کہ ان قرأتوں کی اصلیت پر بحث کیجائے ایک فیصلہ کن امر ایسا موجود ہے کہ جس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن شریف جو بین الدفتین موجود ہے وہی کتاب پاک ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے درمیان چھوڑی۔ اور وہ یہ ہے کہ اتنی وسیع اسلامی دنیا میں اس قدر عرصہ کے درمیان ہر ایک قسم کے اختلاف کے باوجود بھی ایک ہی قرآن کریم موجود رہا ہے اور موجود ہے اور کوئی نسخہ قرآن شریف کا ایسا نہیں دکھایا جا سکتا جو اس کے ساتھ کسی حرکت یا حرف یا لفظ کا اختلاف رکھتا ہو۔ اور نہ ہی حرعمہ قرأتوں میں سے کوئی قرأت بجاے اصل الفاظ کے کبھی قرآن شریف میں لکھی گئی ہے۔ ایک بھی نسخہ قرآن شریف کا ایسا دکھایا نہیں جا سکتا جس میں اس قرآن کریم کے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے کسی لفظ کو چھوڑ کر کوئی دوسری قرأت اس کی بجائے لکھ دی گئی ہو۔ کیا یہ اس بات کی کافی شہادت نہیں ہے کہ قرآن شریف محفوظ اور بلا تغیر تبدل چلا آیا ہے؟ غور کرو کہ تیرہ سو سال کا عرصہ ایک کتاب پر گذرتا ہے۔ اور اس کے بعض نسخے تو مشرق میں پائے جاتے ہیں اور بعض مغرب میں ایسے ایسے ممالک میں جن میں باہمی تعلق کوئی نہیں ہے۔ پھر ایسی ایسی مسلمان اقوام کے اندر اسکے نسخے پائے جاتے ہیں جن کو بچھڑے ہوئے ایک عرصہ بعید گذر گیا ہے۔ پھر ان کے درمیان کسی قسم کے تعلقات نہیں رہے۔ اور پھر ایسے ایسے مسلمان فرقوں کے ہاتھوں میں اس کے نسخے موجود ہیں جو ایکدوسرے کی جان کے دشمن رہے ہیں اور ہیں مگر باوجود اختلاف زمانہ۔ اختلاف ممالک۔ اختلاف زبان۔ اور اختلاف فرقہ کے قرآن شریف ایک ہی رہا ہے خارجی شیعہ کی جان کا دشمن اور شیعہ خارجی کی جان کا دشمن۔ باتیں تو ایک شخص کا اختیار ہے جتنی چاہے بنالے مگر کیا کوئی نسخہ قرآن کا بھی کسی ہاتھ میں ایسا ہی جو اس قرآن کریم سے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے اختلاف رکھتا ہو؟ اب غور کرو کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسری قرأتوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بڑا آدمی قرآن شریف کے بعض الفاظ کو دوسری طرح بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ ان روایتوں کو صحیح فرض کر کے بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ قرأتیں واقع میں کلام الٰہی تھیں یا قرآن شریف کا جزو تھیں نہیں بلکہ اس سے مفصد نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ کہ جو لوگ ان قرأتوں کو پڑھتے تھے وہ درحقیقت انہیں قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے یا یہ کہ جس لفظ کی بجائے وہ کوئی دوسری قرأت اختیار کرتے تھے۔ اس لفظ کو کلام الٰہی کا جزو نہ مانتے تھے اور اسکی

بجائے اپنی قرأت کو قرآن شریف کے اصل لفظ مانتے تھے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ اگر درحقیقت وہ اپنی قرأتوں کو ایسا سمجھتے تو پھر کون شخص مانع تھا کہ وہ اپنے نسخہ جات قرآن میں انہی قرأتوں کو لکھ بھی لیتے جو بجائے الفاظ اصل نسخوں میں موجود تھے۔ ان کو نکال ڈالتے اور اس طرح پر سیکڑوں متفرق نسخے قرآن شریف کے تیار ہو جاتے جن کی اشاعت ہو کر آج اگر ایک اسلامی شہر میں ایک نسخہ ملتا تو دوسرے میں کوئی اور ہی نسخہ ملتا مگر چونکہ ایسے نسخوں کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا معلوم ہوا کہ ایسا اختلافی نسخہ کبھی کوئی موجود ہی نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو اسلامی حکومت کا ڈر تھا اسلئے وہ ان قرأتوں کو لکھ نہ سکتے تھے اور نہ کسی لفظ میں تغیر و تبدل کر سکتے تھے تو یہ جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جب وہ کھلے طور سے دوسری قرأتوں کو پڑھ لیتے تھے اور اس وقت حکومت کا ڈر نہ تھا۔ تو لکھتے وقت کہاں سے ڈر آگیا۔ بلکہ پڑھنے سے تو زیادہ تشہیر ہوتی تھی۔ اور نسخہ میں لکھا ہو نیسے سوائے چند رازداروں کے اور کسی کو اطلاع نہ ہو سکتی تھی۔ پس یا تو یہ بھی جھوٹ ہے کہ وہ دوسری قرأتوں کو پڑھتے تھے اور اعتراض دُور ہوگیا۔ یا اگر یہ صحیح ہے کہ وہ پڑھ لیتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان قرأتوں کو اس قدر وقعت نہ دیتے تھے کہ انہیں جزو قرآن کریم خیال کرتے ہوں۔ اور اسی وجہ سے انکو تحریر کے اندر نہ لاتے تھے۔ اور نہ قرآن کریم کے نسخوں میں جو انکے پاس تھے کوئی تغیر تبدل کرتے تھے۔ بہرحال معلوم ہوا کہ قرأت کے اختلاف سے خواہ اسکی کچھ ہی حقیقت ہو یہ مُراد لینا کہ قرآن شریف کی اصل عبارتیں محفوظ نہیں رہیں اور بعض لوگ ایک لفظ کو قرآن شریف کا جزو سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے کو بالکل غلط خیال ہے۔ بلکہ ایسا خیال کرنا سراسر نادانی ہے +

اب قرأتوں کی اصل حقیقت پر ہم غور کرتے ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ جن قرأتوں کا ذکر بعض روایتوں اور تفاسیر میں پایا جاتا ہے وہ اور سبعۃ احرف والی قرأتیں ایک نہیں اگرچہ ان میں کوئی سبعۃ احرف والی قرأت موجود ہو۔ مگر دونوں کو بعینہٖ ایک سمجھنا اور سبعۃ احرف سے مشہور سات قرأتیں مراد لینا سخت غلطی ہے اور اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو حرف کا لفظ قرأت کی جگہ مستعمل ہونے لگا اور دوسرے قرأتوں کی تعداد بھی سات ہی مشہور ہو گئی اور یہی تعداد احرف کی تھی جس کا ذکر حدیث میں تھا اسلئے بعض لوگوں نے کم فہمی سے سبعۃ احرف اور سات قرأتوں کو ایک سمجھ لیا۔ موجودہ قرأتوں کو جہانتک میں سمجھتا ہوں مفصلہ ذیل عنوانوں کے نیچے رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری قرأتوں سے مُراد

اوّل۔ وہ قرأتیں جو سبعۃ احرف سے پیدا ہوئیں حضرت عثمانؓ نے جو منع فرمایا وہ صرف یہ تھا کہ دیگر حروف کی قرأتیں کو قرآن شریف میں لکھا نہ جائے لیکن بعد میں اگر کسی شخص نے ان کو پڑھ لیا ہو۔ تو ایسا ممکن تھا اور خصوصاً احادیث میں ان کا تذکرہ رہ گیا۔ لیکن موجودہ قرأتوں میں سے سبعۃ [illegible] کی قرأتوں کو الگ کرنا مشکل کام ہے اور نہ ہی اسکی ضرورت ہے۔ بعض لوگوں نے یہ قاعدہ تجویز کیا ہے۔ کہ جو قرأتیں اپنی طرز تحریر میں قرآن شریف سے نہیں ملتیں وہ سبعۃ احرف والی قرأتیں ہیں مگر یہ محض ڈھکوسلا ہے۔ اور اسکی شہادت یا ثبوت ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اور جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے ان قرأتوں کی اجازت ایک وقتی ضرورت کے لیئے تھی۔ اور ان کا پڑھنا یا جاننا کسی مسلمان کیلئے ضروری تھا اور نہ اب ضروری ہے۔ پس ہمیں اس تحقیقات کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دوم بعض اس قسم کے اختلاف